پیام اقبال :- مرتبہ جناب محمد بدیع الزماں صاحب، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت و طباعت بہتر، صفحات ۲۰۰، مجلد مع گرد پوش، قیمت ۴۰ روپے، پتہ بک امپوریم، سبزی باغ پٹنہ وغیرہ۔

جناب محمد بدیع الزماں ریٹائرڈ ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ پھلواری کو ڈاکٹر اقبال کی شاعری سے بڑی دلچسپی ہے اور وہ ایک عرصہ سے اس کے مطالعہ میں مشغول ہیں، یہ کتاب اقبال کے فکر و فن پر سولہ مضامین کا مجموعہ ہے، اس کی ابتدا اقبال کے نظریہ شاعری اور خاتمہ ان کے نظریہ تصوف پر ہوا ہے، پہلے میں بتایا ہے کہ اقبال سے اردو شاعری میں نئے دور کا آغاز ہوا، اور اس میں بلند آہنگی اور بلندئ فکر پیدا ہوئی، اقبال نے شاعری کو پیغامبری کا درجہ دے کر کوہ طور پر ہمکلامی کے لیے تیار کیا بلکہ یا دامن یزداں چاک یا اپنا گریباں چاک کی ترغیب دی، اقبال کے تصوف کو ترک کے بجائے مستی کردار سے عبارت بتایا ہے، اس میں معجزات و کرامات کے بجائے زندگی اور گوہر زندگی کو تلاش کیا ہے، دوسرے مضامین میں خودی، وطنیت، ساقی، انقلاب، حسن و عشق، عقل، طنز، مناجات، خواتین اور شاہین کے بارے میں اقبال کے افکار و تصورات کو نمایاں کرکے اقبال کا کمال و امتیاز دکھایا ہے، ایک مضمون میں اقبال کے خطوط کی روشنی میں ان کے کلام کے چند اہم نکتوں کی وضاحت کی ہے، تین مضامین میں اقبال کے کلام کا فنی حیثیت سے جائزہ لیا ہے۔ پہلے میں ان کے الفاظ کی طلسم آفرینی پر گفتگو کی ہے، اور بتایا ہے کہ الفاظ کے معاملہ میں انکے نظریات انکے نظریہ شاعری ہی سے ہم آہنگ تھے، انھوں نے روایتی الفاظ کو جو اپنی تازگی ختم کرچکے تھے نئے معنی پہنا کر ان کو وسعت و اثر بھی بخشا اور نئے الفاظ وضع کرکے ان کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بھی بنایا، مصنف نے الفاظ کے معاملہ میں اقبال کی دس خصوصیتیں بیان کی ہیں، دوسرے فنی مقالہ میں روایتی اور مروجہ تشبیہات و استعارات کو نئے معنی پہنانے کا ذکر کیا ہے، تیسرے میں اقبال کی شاعرانہ مصوری و پیکر تراشی کے کمالات دکھائے ہیں، اقبال پر بہت لکھا گیا ہے مگر اچھا لکھنے والے پرانے زمین میں بھی نئے گل بوٹے کھلا دیتے ہیں، اس کی مثال یہ کتاب بھی ہے انھوں نے اقبال کی بے کم و کاست ترجمانی کی ہے، انکی محنت و کاوش قدر کے لائق ہے، کہیں کہیں زبان و املا کی غلطیاں بھی ہیں جیسے "جو کسی دوسرے شعرا کے یہاں نہیں ملتا" (ص ۱۴۰) "ماحول کے طابع رہیں گے" (ص ۱۴۳) "لالچ کی جمع لالچیں" (ص ۱۵۳ و ۱۹۶) بھی ذوق پر گراں گذرتی ہے۔

"ض"

جلد ۱۴۱ **ماہ رجب المرجب سنہ ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ مارچ سنہ ۱۹۸۸ء** عدد ۳

مضامین

مقالات

ادبیات

شذرات

دارالمصنفین کی گذشتہ عظمت اور اس کی مہتم بالشان خدمات کی بنا پر اس وقت ملک کے گوشہ گوشہ اور بیرون ملک سے جو خطوط آرہے ہیں ان سے اس ادارہ سے لوگوں کے گہرے تعلق اور غیر معمولی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے، اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس کے قیام و بقار کو ملک و ملت کے لیے کتنا ضروری اور ناگزیر خیال کرتے ہیں، سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم و مغفور کی وفات پر جو تعزیت نامے موصول ہوئے ان میں بھی دارالمصنفین کے لیے بڑی نیک خواہشات اور مخلصانہ جذبات کا اظہار کیا گیا ہے، اور ساتھ ہی ساتھ اس کے آیندہ بقار و تحفظ کے لیے دل کی گہرائیوں سے دعا بھی کی گئی ہے، کچھ خطوط میں موجودہ حالات کی وجہ سے اس کے مستقبل کے بارے میں کسی قدر فکرمندی اور پریشانی بھی ظاہر کی گئی ہے، لیکن یہ اضطراب و تشویش بھی دراصل اخلاص، خیرخواہی اور دارالمصنفین سے واقعی محبت اور دلچسپی ہی کا نتیجہ ہے، فالحمد للہ علیٰ ذالک

مرحوم سید صباح الدین عبدالرحمن کے بعد دارالمصنفین کا جو نیا نظام قائم کیا گیا ہے اس پر بھی اطمینان ظاہر کیا گیا، اور ملک میں اور ملک کے باہر بھی اسے پسند کیا گیا، اس کے تحت معارف کے جو شمارے اب تک شایع ہوئے ہیں انھیں ملاحظہ فرمانے کے بعد متعدد اہل علم نے داد و تحسین پر مشتمل خطوط ارسال فرمائے ہیں، حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ نے ارشاد فرمایا: "شذرات پسند آئے، مناسب ہیں"۔ پروفیسر خلیق احمد نظامی نے تحریر فرمایا "مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ کی ادارت میں معارف کا پرچہ اپنے پرانے معیار کے مطابق شایع ہوا ہے"۔ حکیم عبدالقوی دریابادی صاحب نے اپنے گرامی نامہ میں لکھا: "معارف کے دو پرچے آپ کے مرتب کردہ دیکھے، ماشاء اللہ! توقع کے مطابق آپ لکھ رہے ہیں، امید ہے کہ آپ کی ادارت میں رسالہ اپنی خصوصیات کو قائم رکھے گا"۔ وہ ایک اور مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں: "فروری کا معارف مل گیا، شذرات بہت خوب ہیں"۔ پروفیسر عبداللہ عباس ندوی رقمطراز ہیں: "سب سے پہلے میں آپ کو مبارکباد دیتا ہوں کہ معارف کا معیار قائم رکھنے میں اللہ تعالیٰ نے آپ کو کامیاب کیا"۔ معین احمد علوی کاکوروی صاحب لکھتے ہیں: "دو ماہ سے معارف ماشاء اللہ پہلے کی طرح وقت سے ملنے لگا ہے،

جس سے خوشی ہوئی، مبارکباد قبول کیجیے"۔ مولانا محمد تقی امینی، جناب علی جواد زیدی، خواجہ احمد فاروقی، عابد رضا بیدار اور مولانا برہان الدین سنبھلی نے بھی خطوط لکھ کر عزت افزائی فرمائی۔

بعض مخلصین فرط تعلق کی بنا پر دور دراز کا سفر کر کے یہاں تشریف لائے، اور دارالمصنفین کے کارکنوں کے دلوں پر اپنی قدر دانی، خیرخواہی اور خلوص کا لازوال نقش چھوڑ گئے، سب سے پہلے معارف کی مجلس ادارت کے رکن مولانا ابوالعرفان ندوی نے کرم فرمایا اور یہاں کے حالات کا مشاہدہ فرمانے کے بعد مسرور ہوئے، واپس جا کر حضرت مولانا علی میاں سے بھی اپنا اچھا تاثر بیان کیا، محترم حکیم عبدالقوی دریابادی مدیر صدق جدید ضعف، معذوری اور سفر کی صعوبتوں کی پروا کیے بغیر دارالمصنفین کے خدمت گذاروں کی ہمت افزائی کے لیے تشریف لائے، ادارہ سے مخلصانہ اور بے غرض تعلق انھیں اپنے عم بزرگوار مولانا عبدالماجد دریابادیؒ سے ورثہ میں ملا ہے، گذشتہ مہینہ لاہور (پاکستان) سے پہلے مولانا عطاء اللہ حنیف بھوجیانی مرحوم کے صاحبزادے مولانا حافظ احمد شاکر مالک المکتبۃ السلفیۃ اور پھر مولانا عتیق احمد سلفی مدیر دارنشر الکتب الاسلامیۃ دفعۃً تشریف لائے، لیکن قانونی دشواریوں کی بنا پر زیادہ دیر تک قیام نہ کر سکے، اس لیے ہم اپنی بے سروسامانی کی وجہ سے ان کی خاطرخواہ ضیافت نہ کر سکے تاہم انھوں نے دارالمصنفین سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار جس طرح فرمایا اس سے یہاں کے تمام لوگ بہت متاثر ہوئے، ان کرم فرماؤں نے دارالمصنفین کے حالات معلوم کر کے اور اس کے مختلف شعبوں کو دیکھ کر بڑا اطمینان اور مسرت ظاہر کی اور اس کے خدمت گذاروں کے حوصلے بھی بڑھائے۔

دارالمصنفین کے متوسلین اپنے تمام قدردانوں کے تہ دل سے شکر گذار ہیں، ان شاء اللہ وہ اپنی صلاحیت و استطاعت کے بقدر ان کے اس محبوب ادارہ کی خدمت میں کوئی کمی اور کوتاہی نہ کریں گے، اور یہ جن مفید اور بلند اغراض و مقاصد کے لیے قائم کیا گیا ہے ان کی تکمیل کے لیے وہ اپنی زندگی وقف کر دیں گے۔

دارالمصنفین کے رفقاء و مصنفین بدستور اپنے علمی و تحقیقی کاموں میں مشغول ہیں، اس سال متعدد نئی کتابیں شایع کرنے کا پروگرام بنایا گیا ہے، سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب مرحوم کی آخری تصنیف

"مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف" حصہ اول اسی مہینہ میں چھپی ہے، اور ان شاء اللہ جلد ہی دوسرا حصہ بھی شایع ہوگا، "شذرات سلیمانی" کی تین جلدیں مرتب کر کے کتابت کے لیے دے دی گئی ہیں، اور پہلی جلد کی پلیٹیں تیار کرائی جا رہی ہیں، یہ تینوں جلدیں بھی اسی سال کے اشاعتی پروگرام میں شامل ہیں، "مولانا سید سلیمان ندوی کے نام مشاہیر کے خطوط" اور راقم کی کتاب "تذکرۃ المحدثین" جلد سوم نیز مولوی عمیر الصدیق ندوی کی "تذکرۂ فقہائے اسلام" جلد اول کے زیادہ حصوں کی کتابت ہو چکی ہے، اور جلد ہی طباعت بھی شروع ہونے والی ہے، مولوی عبید اللہ کوٹی ندوی "تذکرۂ فقہائے ہند" کی ترتیب و تالیف میں لگے ہوئے ہیں، مولانا محمد ناظم ندوی نے "سیرت عائشہؓ" کا عربی ترجمہ کیا ہے، جو عنقریب چھپے گا، ہمارے نئے رفیق مولوی محمد عارف عمری اس کے حوالوں کی تصحیح اور احادیث کی تخریج کا کام محنت سے کر رہے ہیں، دارالمصنفین کی مجلس انتظامیہ کے ایک معزز رکن سید اطہر حسین صاحب (سابق آئی۔ اے۔ ایس) "اسلام میں مذہبی رواداری" کا انگریزی زبان میں ترجمہ کر رہے ہیں۔

اس تحریر کا مقصد نہ تو خودستائی ہے، اور نہ بیجا پروپیگنڈا، بلکہ یہ سطریں دارالمصنفین کے ان تمام خیرخواہوں اور قدردانوں کی واقفیت کے لیے لکھی گئی ہیں، جو ملک و بیرون ملک میں پھیلے ہوئے ہیں اور دارالمصنفین کی موجودہ سرگرمیوں کو معلوم کرنے کے لیے مشتاق رہتے ہیں اور اس کے لیے اس کے خدمت گذاروں کو پیہم خطوط لکھتے رہتے ہیں، ایک بہت ہی مخلص اور ہمارے دیرینہ کرم فرما جناب شیخ نذیر حسین صاحب مدیر اردو دائرۂ معارف اسلامیہ انسائیکلوپیڈیا پنجاب یونیورسٹی لاہور سے راقم الحروف کو لکھتے ہیں:

"دارالمصنفین کے آیندہ علمی پروگرام کے بارے میں معارف میں لکھتے رہیے۔"

پروفیسر عبد المغنی صدر شعبۂ انگریزی پٹنہ یونیورسٹی سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب مرحوم کی دعوت پر گذشتہ نومبر میں علامہ شبلیؒ کی "تنقید نگاری" پر توسیعی خطبہ دینے کے لیے دارالمصنفین تشریف لانے والے تھے، مگر افسوس کہ ع آں قدح بشکست و آں ساقی نماند۔ اب یہ پروگرام ۱۰ مارچ کو ہوا جس میں شہر کے دانشور اور اصحاب ذوق بھی شریک ہوئے، مہمان عزیز نے دوسرے روز بھی غالب کا اخلاقی نقطۂ نظر کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا، دونوں مقالے پُرمغز تھے اور آیندہ معارف میں شائع ہوں گے

مقالات

اندلس کا اسلامی تمدن مستشرقین کی نظر میں

از
ڈاکٹر مصطفیٰ الشکعہ صدر دراسات علیا و بحث علمی، جامعہ امارات عربیہ
ترجمہ:۔ محمد عارف اعظمی عمری، رفیق دارالمصنفین

(۳)

اندلس کے اہم اور ممتاز قاضیوں کے وجود کا انکار

اسلام میں نظام قضاء کو بڑی اہمیت حاصل ہے، جس کا مقصد انسانی حقوق کا تحفظ اور عدل و مساوات کا قیام ہے، تاکہ معاشرہ کا ہر فرد خواہ وہ مالدار ہو یا تنگدست، بڑا ہو یا چھوٹا، طاقتور ہو یا کمزور، امن و سکون سے زندگی بسر کر سکے، حضرت عمرؓ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کے نام جو خط بھیجا تھا، اس میں اس کا ایک واضح دستور العمل ملتا ہے۔

اس منصب کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسلامی فوجیں جب کسی مہم پر روانہ ہوتی تھیں تو ان کے لئے ایک اور بعض اوقات کئی کئی قاضی بھی مقرر کئے جاتے تھے، اور انکو وہی حیثیت حاصل ہوتی تھی جو .... شہر کے قاضی کو حاصل ہوتی ہے۔

مسلمانوں میں یہ نظام ابتدا ہی سے رائج رہا ہے، اور اس مسند پر وہی لوگ متمکن ہوتے تھے، جو دینی اس کے اہل ہوتے تھے، چنانچہ اندلس میں فتوحات کے آغاز ہی سے اس کا سلسلہ شروع

ہوگیا تھا، اس لیے وہاں بھی متعدد اہم اور ممتاز قاضی گذرے ہیں، جو عدل و انصاف اور طہارت و پاکیزگی کے علاوہ علمی و ادبی حیثیت سے بھی فائق و برتر تھے، ان میں مہدی بن مسلم، عنترہ بن فلاح اور مہاجر بن نوفل القرشی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قاضی مہدی بن مسلم اندلس کے ایک جدید الاسلام خانوادہ کے گل سرسبد تھے، دینداری تقویٰ اور پرہیزگاری انکا خاص طرۂ امتیاز تھا، علم و ادب سے بھی انھیں خاص دلچسپی تھی، جب وہ اس منصب پر مامور کیے گئے، تو فرمانروا عقبہ بن حجاج السلولی نے ان سے کہا کہ میری طرف سے معاہدۂ قضا آپ خود تحریر فرما دیں، چنانچہ انھوں نے ایک ایسا جامع عہد نامہ مرتب کیا جو تمام ضروری اور اہم امور و مسائل پر مشتمل اور نہایت فصیح و بلیغ زبان میں تھا، یہ معاہدہ حضرت عمرؓ کے مکتوب کی روشنی میں لکھا گیا تھا، اور اس میں اندلس کے نئے اسلامی معاشرہ کی رعایت سے احکام مرتب کیے گئے تھے، یہ معاہدہ بہت طویل ہے[1]، اس کی چند ابتدائی سطریں ملاحظہ ہوں۔

هذا ما عهد به عقبة بن	عقبہ بن حجاج کی جانب سے مہدی بن
الحجاج الى مهدي بن مسلم	مسلم کو منصب قضا د سپرد کرنے کے
حين ولاه القضاء، عهد اليه	وقت کا یہ معاہدہ ہے کہ وہ اللہ کا تقویٰ
بتقوى الله وايثار طاعته	اختیار کریں، اپنے تمام کھلے اور پوشیدہ
واتباع مرضاته في	معاملات میں اسی کی اطاعت و رضا
سر أمره وعلانيته مراقبا	کو مقدم سمجھیں، دل میں اسی کا خیال
له مستشعر الخشية الله	اور خوف جاگزیں رکھیں اور اس کی
معتصما بحبله المتين وعروته	مضبوط رسی کو طاقت سے پکڑے رہیں،
الوثقى موفيا بعهده	اور عروہ وثقی پر گامزن رہیں، اس کے
ومتوكلا عليه واثقا به	عہد کو پورا کریں، اور اسی پر اعتماد و بھروسہ
متقيا منه فان الله	کریں، اور ہر آن اس سے ڈرتے رہیں،
مع الذين اتقوا الذين	کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے کہ وہ انھیں
هم محسنون۔	لوگوں کے ساتھ ہوتا ہے، جو اس سے
	ڈرتے ہیں، اور نیک اعمال کرنیوالے
	ہوتے ہیں۔

[1] علامہ خشنی نے قضاۃ قرطبہ میں معاہدہ کو مفصل نقل کیا ہے، ملاحظہ ہو، ص ۹ و مابعد

دوسرے اہم اور ممتاز قاضی عنترہ بن فلاح بھی بہت عابد و زاہد اور متقی و پرہیزگار شخص تھے، ان کا ایک مشہور قصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ جب وہ استسقاء کی نماز کے لئے کھڑے ہوئے تو ایک شخص نے ان کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ کی دعا اسی وقت مقبول ہوگی، جب آپ اپنی تمام خواہشات نفس کو قربان کر دیں گے، انھوں نے فوراً کہا۔ خداوندا میری خورد و نوش کا سارا اثاثہ تیری راہ میں صدقہ ہے، پھر انھوں نے یہ سب کچھ لوگوں میں تقسیم کر دیا، چنانچہ اسی روز تھوڑی دیر بعد بارش ہوئی۔

تیسرے بزرگ قاضی مہاجر بن نوفل القرشی بھی بڑے عبادت گذار اور متقی تھے، جو لوگ ان کے پاس معاملات لے کر آتے تھے، ان کے ساتھ وہ عجیب و غریب طرح سے پیش آتے تھے، پہلے وہ انھیں خوف خدا کی تلقین کرتے، غلط کاموں پر خدا کے عذاب اور اس کی ناراضگی کا ذکر کرتے اور اس کے دربار میں بندگان خدا کی پیشی اور حاضری کا تذکرہ فرماتے، پھر کہتے کہ قاضی تو صرف اجتہاد اور قیاس کر سکتا ہے، اس کے بعد رونے لگتے، یہ منظر دیکھ کر وہ لوگ بھی خوف خدا سے لرز اٹھتے اور خود ہی اپنے معاملات کا تصفیہ کر لیتے تھے۔

متعصب مستشرقین کی یہ ایک مذموم عادت ہے، کہ اگر انھیں اسلام کا کوئی رخ زیادہ روشن اور تابناک نظر آتا ہے، تو وہ اس کی بدنمائی میں لگ جاتے ہیں، اور اس کے لیے اصل مآخذ میں ردوبدل اور عبارتوں میں قطع و برید کے ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں، جو متانت، سنجیدگی، معقولیت اور انصاف سے خالی اور تاریخی حقائق و شواہد کے خلاف ہوتے ہیں۔

اندلس کے ان اہم اور ممتاز قاضیوں کے بارہ میں بھی انھوں نے یہی نامعقول روش اختیار کی ہے، اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ واقعات ہی تاریخی حیثیت سے درست نہیں ہیں، چنانچہ پروفیسر ڈوزی کے خیال میں یہ واقعات اس لیے غیر معتبر ہیں کہ انھیں علامہ خشنی نے احمد بن فرج بن منتیل کے حوالہ سے نقل کیا ہے[1]۔ جو ابن الفرضی کی ایک روایت کے مطابق ابن مسرہ قرطبی کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے[2]، اور ابن مسرہ کو بعض فقہائے اندلس نے ملحد و بے دین قرار دیا ہے[3]۔ اس لیے ابن منتیل کی بھی روایتیں ناقابل اعتبار ہیں۔

اس طرح پروفیسر ڈوزی نے کمال ہوشیاری اور چابکدستی سے ان تین اہم اور ممتاز مسلمان قاضیوں کے قابل افتخار کارناموں کو محض اس بنیاد پر مشکوک اور غیر معتبر قرار دیا ہے کہ ان کا راوی بعض علماء کے خیال میں ملحد اور بے دین تھا، ہمارے خیال میں گو بعض علماء نے ابن مسرہ کو کافر اور ملحد قرار دیا ہے، تاہم فقہاء کا یہ متفقہ فیصلہ نہیں ہے، پھر ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ کیا تاریخی اخبار و روایات کو نقل کرنے والے ہر ملحد و بے دین شخص کو کاذب اور غیر معتبر سمجھا جائیگا، اگر یہ بات صحیح ہے تو خود پروفیسر ڈوزی پر بھی یہ الزام عائد ہو سکتا ہے، کیونکہ انھوں نے اپنے بے دین اور ملحد ہونے سے کہیں انکار نہیں کیا ہے، رہا محمد بن مسرہ کا معاملہ تو اسے فلسفہ و کلام سے

۱؎ فجر الاندلس، ص ۴۰۰ ۲؎ تاریخ علمائے اندلس، ص ۱۲۰ (عربی ترجمہ) ۳؎ ایضاً ص ۱۲۰۲۔

ضرور اشتغال تھا، اور وہ فلسفہ کا ماہر بھی تھا، مستشرق پالنشیا کے خیال میں وہ اندلس کا پہلا فلسفی مفکر تھا، اور اس نے اپنے فلسفیانہ خیالات زہد و تقویٰ کے پردہ میں چھپا رکھا تھا، مگر اس کا میلان اعتزال کی طرف تھا[1]، اس سلسلہ میں پالنشیا یہ بھی لکھتے ہیں کہ

"اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابن مسرہ کے حلقہ میں بھی کچھ ایسے اشغال اور طریقے رائج تھے، جو صوفیہ کے طریقوں سے مشابہ تھے، اور جن پر ذوالنون مصری وغیرہ کا عمل تھا"

فقہائے معتزلہ اور صوفیہ دونوں ہی کے خیالات و عقائد کی مذمت کی ہے، اور چونکہ ابن مسرہ اور اس کے تلامذہ ان دونوں طبقوں سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے ان کی بھی مذمت کی گئی ہے۔ ان کی مخالفت کرنے والوں میں فقیہ و قاضی قرطبہ محمد بن بقی اور مشہور ماہر لغت ابوبکر الزبیدی سر فہرست ہیں، مگر اکثر فقہاء کے نزدیک ابن مسرہ کے عقائد و نظریات زیادہ قابل اعتراض نہیں ہیں، ایک مرتبہ قرطبہ کے قاضی اور مسجد زہراء کے امام منذر بن سعید البلوطی کے یہاں حاضرین کی ایک مجلس میں ابن مسرہ کے عقائد زیر بحث تھے، مگر خود منذر بن سعید اس معاملہ میں خاموش رہے، جب کہ وہ اس کے معاصر تھے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ابن مسرہ کے عقائد میں اگر واقعتاً کوئی بات اسلامی عقائد و تعلیمات کے منافی ہوتی تو نہ وہ خاموش رہتے، اور نہ انتقال کے بعد اس کے جنازہ میں شریک ہوتے۔

پروفیسر ڈوزی نے محض اسی پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ انھوں نے علامہ خشنی پر بھی یہ الزام عائد کیا ہے کہ وہ دقیق النظر اور نکتہ شناس نہ تھے، اس لیے اپنی کتاب میں ہر رطب و یابس جمع کر دیتے تھے،

مستشرق آسین پلاثیوس اس معاملہ میں پروفیسر ڈوزی سے بھی سبقت لے گئے ہیں، ان کے

۱؎ تاریخ الفکر الاندلسی، ص ۳۲۶۔

خیال میں قاضیوں کے یہ واقعات احمد بن فرج بن منتیل کے وضع کردہ ہیں۔ جن کا مقصد ابن مسرہ کے نقطۂ نظر کو تقویت پہونچانا ہے، ان کے خیال میں ابن مسرہ کا مکتب فکر فلسفیانہ رجحان پر مبنی ہونے کے بجائے مذہب وسیاست کا ملغوبہ تھا۔ اور اسکا مطمح نظر اندلس میں فقہاء کو غلبہ اور تسلط دلانا تھا۔ جس کے لیے یہ اسماء و واقعات رموز و علائم کا کام دیتے ہیں، ورنہ ان ناموں کے قاضیوں کا کوئی وجود اندلس میں نہ تھا۔ بلکہ مہدی بن مسلم ایک ہسپانوی نومسلم کا رمز ہے۔ اور اس سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے۔ کہ ہسپانیہ کے اصل باشندوں کو اول روز ہی سے قضا وعدل سے مناسبت تھی، اسی طرح عنترہ سے دلیر اور بہادر شخص مراد ہے، پلاثیوس نے فلاح کو لام مشدد سے فلاّح سمجھ لیا ہے، جب کہ دونوں کا فرق واضح ہے، اور اس کو کاشتکار کا رمز بتایا ہے، بعض مستشرقین اسی طرح عربی سے ناواقفیت کی وجہ سے بعض عجیب وغریب غلطیاں کرتے ہیں۔

مستشرق جولیان ریبیرا نے علامہ خشنی پر پروفیسر ڈوزی کے الزام کی تردید کی ہے، اور یہ ثابت کیا ہے کہ وہ ایک باوثوق اور معتبر مؤرخ تھے، مگر قاضیوں کے واقعات کے سلسلے میں انکا بھی رجحان آسین پلاثیوس ہی کے مانند ہے، وہ بھی انھیں تاریخی حقیقت کے بجائے اوہام وتخیلات کا مجموعہ خیال کرتے ہیں۔

مگر ان سب کے برخلاف لیوی پروونسال نے ان واقعات کو تاریخی حیثیت سے صحیح بتایا ہے، اور ابوالحسن النباہی کی کتاب "تاریخ قضاۃ الاندلس" کے مقدمہ میں جو انھیں کے قلم سے ہے، ان مستشرقین کے خیالات کی تردید کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جو مستشرقین مسلمانوں کی تاریخ پر عبور رکھتے ہیں۔ اور جن کو اظہار وبیان میں غیر معمولی کمال بھی حاصل ہوتا ہے، ان کے لیے بھی اسلامی عقائد سے مکمل واقفیت نہ ہونے کی بنا پر کچھ امور ناقابل فہم ہوتے ہیں، چنانچہ مہدی بن مسلم کا واقعہ اس وجہ سے ان کے

نزدیک باور کئے جانے کے لائق نہیں ہے کہ کسی قاضی کا ایسا معاہدہ کتنا بعید از قیاس ہو جس میں خود اس نے فرمانروا کی جانب سے اپنے ہی آپ کو اس قدر پابند کیا ہو، پھر اس معاہدہ کی دفعات میں نظام قضاء کا جو واضح تصور اور دستور العمل پیش کیا گیا ہے۔ اس سے مستشرقین کا معاشرہ محروم ہے۔ اس بنا پر بھی انھیں یہ خیال گذرا کہ یہ باتیں خیالی اور فرضی ہیں، عنترہ بن فلاح کے واقعۂ استسقاء کو بھی انھوں نے اسی نقطۂ نگاہ سے دیکھا ہے، اور اس قسم کی باتیں ان کے نزدیک افسانہ کی حیثیت رکھتی ہیں، جب کہ مسلمانوں کے نزدیک یہ ایک حقیقت ہے۔ اور وہ اس پر یقین کامل رکھتے ہیں، کہ دعا کرنے سے بارش ہوتی ہے۔

اسی طرح مہاجر بن نوفل القرشی کا واقعہ بھی ان کے نقطۂ نظر سے خارج از قیاس ہے کہ بھلا کوئی قاضی قانون اور انصاف کے مطابق فیصلہ کرنے کے بجائے لوگوں کو ظلم وتعدی سے باز رہنے کی نصیحت کرے گا۔ جس سے متاثر ہو کر لوگ اپنے نزاعی معاملات کا تصفیہ خود ہی کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔

دراصل مستشرقین کا انداز فکر ہماری زبان، تہذیب اور عقیدہ سے ناواقفیت کی غمازی کرتا ہے، وہ اپنے خاص نقطۂ نظر اور انداز فکر کے مطابق واقعات کی تحلیل وتجزیہ کرتے ہیں، اس لئے انھیں یہ ساری باتیں نامانوس اور عجیب وغریب معلوم ہوتی ہیں۔

مسلمان مفکرین کے بارہ میں غلط بیانیاں

بعض مستشرقین نے اندلس کے مسلمان فلاسفہ اور مفکرین کو بھی نہایت شدومد سے متہم ومجروح کرنے کی کوشش کی ہے جس کا ایک دلچسپ پہلو یہ ہے کہ اس بارہ میں خود ان کے اقوال باہم اتنے متناقض ومتضاد ہیں کہ خود وہی ایک دوسرے کی تردید وتکذیب کے لیے کافی ہیں۔

ابوعبیدہ عبداللہ بن عبدالعزیز البکری (د ۴۳۲ھ - ۴۸۷ھ)، اندلس کے ایک ممتاز مفکر تھے۔

ان کی مندرجہ ذیل کتابیں زیادہ مشہور ہیں، (۱) کتاب المسالک والممالک۔ (۲) کتاب النبات۔ (۳) کتاب معجم ما استعجم۔ ہسپانوی تاریخ پر بحث کے سلسلہ میں بعض مستشرقین نے ان کے فضل وکمال کا اعتراف کیا ہے، اور انھیں ان کے بیش قیمت علمی کارناموں خصوصاً ان کی کتاب معجم ما استعجم پر خراج تحسین بھی پیش کیا ہے، چنانچہ پالنثیا کے خیال میں یہ اندلس کے بڑے عالی مرتبت جغرافیہ دان تھے[1] اور پروفیسر ڈوزی بھی انکے فضل وکمال کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے، چنانچہ لکھتے ہیں۔

"اندلس میں ابو عبیدہ البکری سے بڑا کوئی جغرافیہ کا عالم نہ تھا"

مستشرق پالنثیا اور پروفیسر ڈوزی کا یہ اعتراف بالکل مبالغہ پر مبنی نہیں ہے، بلکہ وسیع مطالعہ اور بحث وتحقیق کا نتیجہ ہے۔ اور آج بھی ابو عبیدہ البکری کی کتاب معجم ما استعجم علم جغرافیہ میں سب سے اہم اور مستند ماخذ تسلیم کی جاتی ہے، اس کتاب کے بارہ میں پروفیسر ڈوزی کا یہ اعتراف بجا ہے کہ۔

"عموماً جغرافیہ کے بعض ماہرین بھی بڑی اہم غلطیوں کے مرتکب ہوجاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک ہی مصنف کے بیان میں کبھی کبھی تضاد ہوجاتا ہے، مگر البکری کے پیش کردہ معلومات واضح اور درست ہیں"

اس کے برعکس مستشرق سیمونیٹ ابو عبیدہ البکری کو جغرافیہ کا عالم وماہر نہیں مانتے اور بالکل بے بنیاد طور پر اس کے اہم علمی کارنامے کو یہ لکھکر مجروح کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ۔

"ابو عبیدہ البکری کی یہ کتاب اشبیلیہ کے لایزیدور کی کتاب اصول کلمات (Etimologias) کے مطالعہ واستفادہ کا نتیجہ ہے، جو اس کے زمانہ میں عربی میں منتقل کی جاچکی تھی۔ اور اس کے بعض مباحث ابو عبیدہ کی کتاب میں بھی موجود ہیں"

حالانکہ از روئے تحقیق یہ بات درست نہیں ہے کہ لایزیدور کی کتاب کا اس زمانہ میں

[1] تاریخ الفکر الاندلسی۔ ص ۳۰۹

عربی میں ترجمہ ہوچکا تھا۔

مستشرقین نے اندلس کے مسلم فلاسفہ اور محققین کی کتابوں کی عظمت واہمیت ہی کو کم کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے، بلکہ انھوں نے مسلمانوں کے ائمہ وعلماء کو بھی مطعون ومجروح کرنے کی کوشش کی ہے، چنانچہ مشہور جرمن مستشرق جوزف شاخت، امام ابو عمرو عبد الرحمٰن الاوزاعیؒ کے بارہ میں لکھتے ہیں۔

"امام اوزاعیؒ، امام مالکؒ کے معاصر اور دوست تھے، یہ اہل شام کے امام تھے، موجودہ بیروت میں ان کی جائے قیام تھی، اور امام مالکؒ امام دار الہجرت تھے دونوں بزرگوں میں اکثر حج کے موقع پر ملاقات ہوتی تھی، اور ان کے درمیان فقہی مسائل کا بحث اور تبادلۂ خیال بھی ہوا کرتا تھا۔ اندلس کے فاتحین کے ہراول دستہ میں اکثر اہل شام ہی شامل تھے، اس لیے اس ملک میں امام اوزاعیؒ کے مسلک کو فروغ حاصل ہوا، اور وہاں اسی مسلک پر عمل ہوتا رہا۔ مگر ایک خاص واقعہ کے بعد امیر ہشام کے حکم سے امام مالکؒ کے مسلک پر فتوی دیا جانے لگا"

جوزف شاخت نے کسی معتبر ماخذ کا حوالہ دیئے بغیر یہ بھی لکھا ہے، کہ امام اوزاعیؒ کا فقہی مسلک رومی قانون سے ماخوذ تھا[1]۔

اولاً تو امام اوزاعیؒ جیسے بلند پایہ فقیہ اور عالم کے بارے میں یہ خیال ہی غلط ہے، کہ انھوں نے اسلامی شریعت کے بجائے کسی دوسرے سرچشمہ سے فیض یاب ہوئے ہوں گے دوسرے از روئے تحقیق بھی جوزف شاخت کا بیان صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ کسی معاملہ میں اصل حقیقت ونوعیت اور اس کے درست نتیجہ تک پہونچنے کے لیے ایک بنیادی اور مسلمہ اصول ہے کہ پہلے اس کے تمام جزئیات اور مختلف پہلوؤں کا احاطہ کیا جائے، امام اوزاعی کے فقہی مسلک کے بارہ میں بھی

[1] دی اوریجنس آف محمڈن جورس پروڈنس۔ ص ۲۸۸

کوئی فیصلہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے ان کے تمام فقہی اصول وجزئیات کا احاطہ کیا جاتا اور پھر ان کا دقت نظر سے مطالعہ کیا جاتا، لیکن جوزف شاخت نے ایسا نہیں کیا، اس سلسلہ میں ایک بڑی دشواری اس لیے پیدا ہوئی کہ امام اوزاعیؒ کے فقہی اصول وجزئیات کہیں یکجا طور پر ملتے نہیں ہیں، بلکہ مختلف فنون کی کتابوں میں منتشر ہیں، چند برس قبل ڈاکٹر عبد اللہ محمد الجبوری نے بڑی محنت اور عرق ریزی سے انھیں یکجا کرنے کی کوشش کی تھی، اور اسی پر انھیں جامعہ ازہر سے ڈاکٹریٹ کی سند بھی ملی تھی، یہ کتاب دو ضخیم جلدوں میں فقہ امام اوزاعیؒ کے نام سے وزارۃ الاوقاف العراقیہ بغداد سے ۱۳۹۷ھ/۱۹۷۷ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوئی ہے۔

امام اوزاعیؒ کے پورے دور میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا مشرق ومغرب کے اکثر ملکوں میں فوجیں نبرد آزما رہتی تھیں، دار الاسلام اور دار الحرب کی حد بندیاں قائم ہو چکی تھیں۔ اس کے نتیجہ میں نئے نئے واقعات وحوادث اور نوع بنوع مسائل پیش آرہے تھے، جن کے بارے میں امام صاحب نے شریعت اسلامی کی روشنی میں فتوے دئے اس لئے ان کی فقہ میں یہی عنصر غالب تھا جس کے نتیجہ میں متأخرین فقہاء نے ان کی فقہ کو فقہ عسکری کا نام دیا ہے۔

امام صاحب نے گوناگوں اہم مسائل پر بحث وگفتگو کی ہے، لیکن اس مقالہ میں ان سب کا جائزہ لینا ممکن نہیں ہے، یہاں چند مسائل کی فہرست درج کی جاتی ہے، مشرکین کو آگ میں جلانے یا ان پر منجنیق سے پتھر برسانے کا حکم، دشمن کے علاقوں میں تخریب اور آتش زنی، مال غنیمت کے مسائل اور ذمیوں کے احکام۔ جہاد میں بچوں کی شرکت کے لیے والدین کی اجازت کا حکم۔ میدان جنگ تک مسلمان فوجیوں کا اپنے اہل وعیال کو ساتھ لیجانا۔ جب مشرکین اپنی عورتوں بچوں یا مسلمان قیدیوں کو سپر بنالیں یا ایسے قلعوں میں

محصور ہو جائیں جہاں مسلما قید ہوں تو ان سے جہاد کی صورتیں۔ قیدیوں کو سزا اور امان دیے جانے کے احکام۔ قبول اسلام کے بعد مستأمن اور حربی کے ساتھ برتاؤ۔ دار الحرب میں مقیم مسلمانوں کے مال ومتاع کا حکم۔ جنگ کے دوران خاوند اور بیوی دونوں ساتھ ساتھ یا صرف ایک یا دونوں کے بال بچوں سمیت قید ہو جانے کی صورت میں اور ان کے احکام، معرکہ کارزار میں مشرکین سے اعانت طلب کرنے کا حکم وغیرہ۔

غرض یہ اور اسی قسم کے بہت سے دوسرے مسائل ہیں، جن پر امام اوزاعیؒ نے اپنے فتوؤں میں بحث کی ہے، جن کے مطالعہ سے پوری طرح منکشف ہو جاتا ہے، کہ امام صاحب کے فتوے نہ صرف یہ کہ رومی قانون سے ماخوذ نہیں ہیں، بلکہ اس سے متصادم بھی ہیں امام صاحب کا اصلی مصدر وماخذ صحف سماوی اور شریعت خداوندی ہے، چنانچہ انھوں نے جو بھی فتوے دیئے ہیں ان کی توثیق وتائید کے لیے یا تو کوئی آیت شریفہ یا ارشاد رسولؐ پیش کیا ہے۔ یا پھر اجتہاد وقیاس سے کام لیا ہے، اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ان احکام کی بنیاد رومی قانون وآئین ہے، بلکہ اس کے برعکس ان کی اساس مذہب اسلام اور اقوالِ سلف پر ہے۔ اد یوں بھی اسلامی ہدایت وقانون کی جامعیت اور فقہائے اسلام کی خدا داد غیر معمولی صلاحیتوں کے بعد مسلمان کسی دوسرے طریقۂ کار کے محتاج اور دست نگر نہیں بھی ہیں۔

علامہ ابن رشد کو بدنام کرنے کی سازش

اسی طرح اندلس کے عظیم فلسفی اور بلند پایہ مفکر ابو الولید محمد بن احمد بن رشد (۵۲۰ھ - ۵۹۵ھ) کی شخصیت اور اس کے مذہبی عقائد کے بارے میں بھی مستشرقین نے بڑی غلط فہمیاں پھیلائی ہیں، جن سے بعض سادہ لوح علمائے مشرق بھی ان کے بارہ میں غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں، اس لیے وہ سمجھتے ہیں کہ ابن رشد کی نسبت مستشرقین کا طرز عمل ناروا نہیں ہے، کیونکہ انھوں نے ان کی متعدد کتابوں کے ترجمے اپنی مادری زبانوں میں

کئے ہیں، اور انھیں ایک عجمی نام ابفروس سے بڑی شہرت دی ہے۔ نیز ان کی کتابوں کے ترجمے اصل عربی ناموں ہی سے کئے گئے ہیں جیسے فن طب میں ان کی کتاب الکلیات کا ترجمہ کولیگٹ (Colliget) کے نام سے شائع کیا گیا ہے۔

ایک دفعہ خود راقم نے مصر کے کسی کالج میں اس کے ایک استاد سے اندلس کے اسلامی تمدن پر اظہار خیال کرتے ہوئے یہ سنا کہ۔

"اس ملک میں آزادیٔ رائے کا یہ حال تھا کہ فلسفی ابن رشد سے بھی جو بعث بعد الموت کا منکر تھا، کسی قسم کا تعرض نہ کیا جاتا تھا۔"

مجھے یہ سن کر سخت تعجب ہوا، اس لئے میں نے ان سے دریافت کیا کہ ابن رشد نے اپنی کس کتاب میں اس عقیدہ کا انکار کیا ہے، تو انھوں نے براہ راست ابن رشد کی کسی کتاب کے بجائے مستشرقین کی تحریروں کا حوالہ دیا۔

اس واقعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مستشرقین نے اس عظیم الشان فلسفی اور مفکر کے مذہبی خیالات و عقائد کو کس درجہ مسخ کر کے پیش کیا ہے، اور اس سے بھی زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ خود مسلمان ان کے فریب کا شکار ہو گئے ہیں، جب کہ مشہور مستشرق پالنثیا لکھتے ہیں۔

"ابن رشد کے افکار و خیالات قطعاً گمراہی اور بدعقیدگی پر مبنی نہ تھے"۔[1]

البتہ وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ۔

"کہا جاتا ہے کہ ابن رشد حقیقت دوگانہ کا قائل تھا، یعنی دین اور فلسفہ دونوں کی حقانیت کا قائل تھا۔ اور وہ دونوں کو متضاد مانتے ہوئے بھی دونوں کی صحت و صداقت کو بھی تسلیم کرتا تھا"۔[2]

[1] تاریخ الفکر الاندلسی۔ ص ۳۵۵ [2] ایضاً ص ۳۶۹۔

گو پالنثیا نے جو کچھ لکھا ہے، اس پر انھوں نے اپنی طرف سے تصدیق ثبت نہیں کی ہے، بلکہ اسے دوسروں کے حوالہ سے نقل کیا ہے، تاہم بحث و تحقیق کا تقاضا تھا کہ وہ ان لوگوں کے ناموں کی صراحت کرتے جنھوں نے ابن رشد کے اس نظریہ کا ذکر کیا ہے۔

اسی طرح مستشرق قنوطی ولف لکھتے ہیں کہ۔

"ابن رشد افرادی نفوس کے خلود کا قائل نہ تھا یعنی نفس جزئی جو ان کی اصطلاح میں نفس انفعالی ہے وہ فنا ہو جائے گا۔ مگر انسان کا نفس نوعی جس کو وہ نفس فعلی سے تعبیر کرتے ہیں وہ باقی و دائم رہے گا"۔[1]

ابن رشد کے مذہبی عقائد و افکار کے بارہ میں مستشرقین کے اس قسم کے تصورات کا باعث اس کی کتابوں کے لاطینی ترجمے ہیں، جو ان کا اصل مآخذ ہیں۔ ان میں بہت رد و بدل اور حذف و اضافہ کیا گیا ہے، اس کا اعتراف مستشرق پالنثیا کو بھی ہے، چنانچہ ان کے خیال میں اس سبب سے ابن رشد کے افکار و خیالات کا سمجھنا دشوار ہو گیا ہے۔

دراصل چودھویں صدی عیسوی کے اوائل سے یورپین مصنفین نے ابن رشد کو متہم اور مجروح کرنے کی ایک منظم اور باقاعدہ مہم شروع کی جس کو کامیاب بنانے کے لئے اس کے مذہبی خیالات و عقائد کی بحث چھیڑ دی گئی۔ تاکہ اسے ملحد اور دین بیزار ثابت کیا جاسکے۔ اس زمانہ میں اس کی طرف ایک فرضی کتاب بھی منسوب کر دی گئی۔ اور اس کے حوالہ سے یہ کہا جانے لگا کہ وہ مذاہب باطلہ سہ گانہ یعنی یہودیت، نصرانیت اور اسلام کی وحدت کے تخیل کا موجد ہے۔[2] جب کہ خود یہی لوگ اس کے بھی معترف ہیں کہ یہ کتاب ان کی نظر سے نہیں گذری ہے۔

[1] تاریخ الفکر الاندلسی۔ ص ۳۶۰۔ [2] ایضاً ص ۳۶۹۔

ابن رشد کے سلسلے میں مستشرقین میں سب سے معتدل اور منصف شخص آسین پلاثیوس معلوم ہوتے ہیں۔ انھوں نے اس کے عقائد و افکار اور اس کی تصانیف کا وسیع مطالعہ کیا ہے۔ مگر ان کی بھی انصاف پسندی کا دائرہ بہت محدود ہے۔ ان کے خیال میں ابن رشد نے نظریۂ حدوث عالم اور مشائین کے نظریۂ قدم عالم کے درمیان تطبیق دینے کی کوشش کی ہے اور یہ اس کا زبردست کارنامہ ہے۔ مگر ہمارے خیال میں یہ بات ناممکن ہے۔ بلکہ حدوث کائنات ہی ایک قطعی حقیقت ہے۔ اور ذات الٰہی اس کی خالق ہے۔ پلاثیوس چونکہ ابن رشد کی تطبیق کو اس کا بڑا کارنامہ تصور کرتے ہیں اس لیے وہ اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں۔

"قرطبہ کے اس مسلمان فلسفی کا سب سے زبردست اور قابل قدر کارنامہ یہ ہے کہ اس نے اس میدان میں قدم اٹھایا جس سے حکمت و شریعت کے درمیان ربط و ہم آہنگی کا دروازہ کھلتا ہے، جو ایک بڑی اہم چیز ہے۔ چنانچہ توما کوینی جیسا مفکر راہب بھی ابن رشد کے اس نظریہ کو تسلیم کرتا ہے۔"[1]

پلاثیوس نے ابن رشد کی جانب منسوب اس نظریہ کی مکمل نفی کی ہے کہ وہ حقیقت دوگانہ یعنی دین و فلسفہ کا قائل تھا۔ ان کے خیال میں یہ نظریہ اس کا نہیں بلکہ محی الدین بن عربی کی رائے معلوم ہوتی ہے، البتہ ابن رشد مذہب اور عقل کے درمیان توفیق و ہم آہنگی کا قائل ضرور تھا۔

اس طرح مستشرقین نے ابن رشد کو ملحد اور بے دین ثابت کرنے کی جو سعی کی ہے، پلاثیوس نے اس کی بھی پرزور تردید کی ہے۔ البتہ انھوں نے اس کے مذہب و عقیدہ کا جو تصور پیش کیا ہے اس پر اسلامی عقائد و نظریات کے بجائے مسیحی افکار کی زیادہ چھاپ دکھائی دیتی ہے۔

ابن رشد قرطبہ کے مشہور قاضی و فقیہ ابو الولید محمد بن احمد بن رشد کے پوتے تھے، یہ اور

[1] تاریخ الفکر الاندلسی۔ ص ۳۶۵۔

ان کے دادا ہم اسم اور ہم کنیت ہیں، اور دونوں مختلف علوم و فنون بالخصوص اسلامی فقہ و قانون کے ماہر اور مشہور عالم تھے، مورخین نے ان کے درمیان فرق و امتیاز کے لیے انھیں ابن رشد الاصغر اور ان کے دادا کو ابن رشد الاکبر کہا ہے۔

ابن رشد الاصغر جن کی شخصیت موضوع بحث ہے ایک بڑے قاضی فقیہ اور مفکر تھے۔ یہ اشبیلیہ کے بھی قاضی رہ چکے ہیں۔ جو اس زمانہ کا بہت اہم شہر تھا۔ اور اس کے منصب قضا پر بلند پایہ فقہا ہی فائز کئے جاتے تھے، فقہ میں ابن رشد کی نہایت اہم کتاب "بدایۃ المجتہد و نہایۃ المقتصد" ہے، جس کو انھوں نے اپنے دادا کے تتبع میں قلم بند کیا تھا۔ جنھوں نے المدونۃ الکبریٰ سے امام سحنون اور ابو قاسم مصری کی روایتوں کو اپنی تصنیف المقدمات میں یکجا کیا تھا۔ بایں ہمہ یہ درست ہے کہ بعض فقہا نے انھیں گمراہ اور مرتد بھی قرار دیا ہے۔ مگر صرف اسی کو ان کے گمراہ ہونے کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا، کیونکہ کبھی کبھی فقہا معمولی باتوں پر بھی ایک دوسرے کی تضلیل کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اگر ابن رشد واقعی گمراہ ہوتے تو چار برس کی جلاوطنی کے بعد جب فرمانروا ابو یعقوب المنصور نے انھیں دوبارہ مراکش اپنے محل میں بلایا تھا، اس وقت یہ فقہا ضرور اس مسئلہ کو اٹھاتے۔

ابن رشد کے اساتذہ و تلامذہ میں بعض نہایت برگزیدہ اشخاص تھے، جیسے ان کے استاد ابو بکر بن طفیل ایک بلند پایہ بزرگ تھے اور ان کے تلامذہ میں ابو الحجاج محمد بن طلموس غرناطی (۵۵۹ھ۔ ۶۲۰ھ) نے تو متواتر چالیس برس تک درس قرآن دیا ہے، کیا اس پایہ کے لوگ ان کے گمراہ ہوتے ہوئے انھیں اپنے حلقۂ درس میں داخل کر لینا یا ان کے حلقۂ درس میں شامل ہونے کو پسند کرتے؟ خود ابن رشد کی کتابیں بھی اس کے صحیح العقیدہ ہونے کی شاہد ہیں۔ انکی ایک طویل الاسم کتاب "الکشف عن مناہج الادلۃ فی عقائد الملۃ و تعریف

ما وقع فیھا بحسب التأویل من الشبہ المزیفۃ والبدع المضلۃ" ہے۔

یہ خالص ایمانیات وعقائد کی بحثوں پر مشتمل ہے، اس کتاب کے اس قدر طویل نام ہی سے پتہ چلتا ہے کہ ابن رشد محض ایک فلسفی ہی نہ تھا، بلکہ اسلامی عقائد وتعلیمات کا واقف کار اور مسلمانوں کی اصلاح کا آرزومند بھی تھا، چنانچہ اس کتاب میں انھوں نے مسلمانوں کو ان تمام شکوک وشبہات اور اوہام وخرافات سے متنبہ اور خبردار کیا ہے، جو گمراہی کا باعث بن سکتے ہیں۔

ابن رشد کی یہ کتاب کئی ابواب میں منقسم ہے، اس میں خدائے تعالےٰ کی حقانیت کو ثابت کرکے اس کی وحدانیت پر متعدد دلائل فراہم کئے گیے ہیں، اور اس بات کی بھی وضاحت کی گئی ہے، کہ بنی نوع انسان کی ہدایت واصلاح اور اس پر اتمام حجت کے لئے انبیاء ورسل کی بعثت ہوئی ہے۔ کتاب کے آخر میں بعث بعد الموت اور قیامت کا مفصل تذکرہ ہے۔ اسی میں ابن رشد نے اسلام کے اس بنیادی عقیدہ کو بھی صراحتاً حق اور درست بتلایا ہے، اور اعتراف کیا ہے کہ بعث بعد الموت کا تعلق ارواح واجسام دونوں سے ہے، البتہ ان کے خیال میں اخروی اجسام دنیاوی اجسام کے مماثل ہونگے مگر متحد نہ ہونگے، جب کہ اللہ تعالےٰ ہر چیز پر قادر ہے۔

مستشرقین کی اس سے بڑھ کر اور کیا خیانت ہو سکتی ہے کہ انھوں نے ابن رشد کی کتابوں سے قطع نظر کرکے اس پر خواہ مخواہ بے بنیاد الزام تراشیاں کی ہیں، جب کہ ابن رشد نے صاف اور واضح انداز میں ذات باری کو رب واحد، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا فرستادہ اور قرآن کریم کو کتاب ہدایت تسلیم کیا ہے، اور ملائکہ، آسمانی کتابوں، انبیاء ورسل اور یوم آخرت کو برحق بتلایا ہے۔ اس تفصیل سے ظاہر ہو گیا ہوگا کہ نہ صرف ابن رشد بلکہ اس کا پورا خاندان بے دینی ضلالت اور گمراہی سے محفوظ تھا۔

موشحات اور مستشرقین موشح اور زجل عربی شاعری کی دو مشہور صنف سخن ہیں، جن کی جانب اندلس کے

شعراء نے زیادہ اعتنا کیا ہے، اور ان سے ان کے فنی کمال کا پوری طرح اندازہ ہوتا ہے، اس کی بنا پر بعض مستشرقین کو یہ خیال ہوا کہ یہ عربی کے بجائے، لاطینی الاصل اصناف کلام ہیں۔ یہ خیال مستشرق ریبیرا کی ذہنی ایجاد کا نتیجہ ہے، اور انھوں نے اسکو ثابت کرنے کیلئے بڑی طویل بحث وگفتگو کی ہے، ان کے خیال میں اندلس کے ابتدائی اسلامی عہد میں مسلمانوں میں عامیانہ درجہ کی لاطینی رائج تھی، جس کا نام al Romance تھا عربی اور لاطینی زبانوں کے امتزاج اور دوسرے عوامل کے اثر سے شعر کی یہ نئی صنف وجود میں آئی، اور اس کا آغاز عوام کے طبقہ میں ہوا، پھر بتدریج اس نے دو مستقل صنفیں اختیار کرلیں ان میں سے ایک کو زجل اور دوسرے کو موشح کہا جانے لگا[1]۔

ریبیرا نے اپنے اس خیال کی تائید میں ہسپانوی شاعر الوار یز ڈی فیا ساندیو کے غزلیہ اشعار اور ابن قزمان کی زجل نظموں کا تقابل بھی کیا ہے اور اس سلسلہ میں مستشرق منندر پائڈل کے یہ خیالات بھی نقل کئے ہیں کہ:۔

"زجل نظموں کی زبان عربی ضرور ہے، مگر یہ عامی اور غیر فصیح زبان میں ہوتی ہیں، اور ان میں بکثرت غلطیاں بھی ہوتی ہیں، البتہ ان میں اوزان وقوافی کا پورا لحاظ رکھا گیا ہے مگر عربی نظم کی خصوصیات مفقود ہیں"۔

مستشرق جارج مس بھی ان اصناف کو لاطینی الاصل بتاتے ہیں، ان کے خیال میں یہ اصلاً ہسپانوی گیت تھے، جنھوں نے موشحات کی صورت اختیار کرلی ہے، درحقیقت شعر کی یہ دونوں اصناف عربی الاصل اور مشرق کی طبع زاد ہیں، زجل دوسری صدی ہجری میں عباسیوں کے عہد حکومت میں بغداد میں وجود میں آئی اور موشح اس سے بھی قدیم ہے، آنحضرتؐ ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لائے تو اسوقت اہل مدینہ نے آپ کے استقبال میں جو گیت گائے تھے وہ اصلاً موشح ہی کی قسم تھی جس میں اندلس کی موشح نظموں کی اکثر خصوصیات موجود تھیں پھر یہ مشرق میں ارتقائی مراحل طے کرتی رہی، مگر مشرق میں نہ اسکا کوئی نام تھا اور نہ ہی اسکے اجزائے ترکیبی متعین تھے، یہ کام شعرائے اندلس نے کیا اور اسے ایک مستقل صنف کی حیثیت سے متعارف کرایا۔

[1] تاریخ الفکر الاندلسی۔ ص ۱۴۳ ومابعد

امام بخاریؒ کی التاریخ الکبیر
اور
اس سے متعلق کتابیں

از مولانا قاضی اطہر مبارک پوری، سابق اڈیٹر البلاغ بمبئی۔

علم حدیث میں اسناد کی بڑی اہمیت ہے، اسی سے اس کی صحت وسقم کا علم ہوتا ہے، عبد اللہ ابن مبارک کا قول ہے۔

الاسناد من الدین، ولولا الاسناد لقال من شاء ماشاء

سند ایمان کا ایک شعبہ ہے، اگر سند نہ ہوتی تو حدیث کے نام پر جو شخص جو چاہتا کہتا۔

اور سفیان ثوریؒ نے کہا ہے۔

الاسناد سلاح المومن، فاذا لم یکن معہ السلاح فبای شئ یقاتل؟

سند مومن کا حربہ ہے، اگر اس کے پاس یہ حربہ نہ ہو تو کس چیز سے جنگ کرے گا؟

اس قول کی عملی شرح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

لما استعمل الرواۃ الکذب استعملنا لھم التاریخ۔[1]

جب حدیث کے راویوں نے کذب بیانی سے کام لیا تو ہم نے ان کے مقابلہ کے لیے تاریخ سے کام لیا۔

۱؎ جواہر الاصول فی علم حدیث الرسول۔ ص ۷ و ص ، و ص ۱۳۴۔

عام تاریخوں میں گذشتہ اقوام وملل اور افراد واشخاص کے انساب واحوال، رسوم وعادات اور ان کے کارناموں کا تذکرہ ہوتا ہے، جن سے بعد کے لوگ عبر ونصائح اور مفید نتائج اخذ کرکے اپنی اجتماعی وانفرادی زندگی میں کام لیتے ہیں، مگر محدثین کے نزدیک علم حدیث کی ایک خاص قسم کا نام تاریخ ہے، جس میں حدیث کی سند کے رُواۃ ورجال کے موالید ووفیات، اصحاب وشیوخ، اوطان واماکن، رحلات واسفار اور ایسے حالات بیان کئے جاتے ہیں، جن سے ان رواۃ ورجال کی جرح وتعدیل پر صحیح حکم لگایا جاسکے، اور سند کا اتصال یا انقطاع معلوم ہو، امام سخاویؒ نے علم حدیث کی یہی تعریف کی ہے۔[1]

یہ فن جتنا اہم اور ضروری ہے، اتنا ہی مشکل اور دقت طلب ہے، اس میں سب سے پہلی مفصل کتاب امام بخاریؒ کی التاریخ الکبیر ہے، جو اس سلسلہ کی بعد کی کتابوں کے لیے اصل اور ماخذ ہے، یہاں اس کتاب اور اس سے متعلق بعض ناقدانہ کتابوں کا مختصر تذکرہ وتعارف مقصود ہے۔

امام بخاری کی عظمت وامتیاز

امیر المومنین فی الحدیث امام ابو عبد اللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری (ولادت ۱۹۴ھ وفات ۲۵۶ھ) رحمۃ اللہ علیہ ایام طفلی ہی میں حدیث کے جملہ علوم وفنون میں امتیازی حیثیت اور مرجعیت کے مرتبہ کو پہونچ گئے تھے، اور اسی زمانہ میں ان کے اساتذہ ومعاصرین اس کا اعتراف کرنے لگے تھے، موقع کی مناسبت سے اس سلسلہ میں چند واقعات ملاحظہ ہوں۔

امام صاحب کے وراق اور ان کے کتابوں کے ناقل ابو جعفر محمد بن ابو حاتم نحوی کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں نے امام صاحب سے ان کے طلب علم کے ابتدائی حالات معلوم کئے تو

۱؎ حاشیہ تدریب الراوی۔ ص ۵۰۴۔

انھوں نے بتایا کہ دسؔ سال سے کم ہی کی عمر میں مجھے حفظ حدیث کی توفیق مل گئی تھی، اور دسؔ سال کی عمر میں مکتب سے فارغ ہو کر اپنے استاد داخلیؒ وغیرہ کے حلقۂ درس میں آنے جانے لگا تھا۔ ایک دن اثنائے درس میں داخلی نے ایک حدیث "سفیان، عن ابی الزبیر عن ابراہیم" کی سند سے بیان کی میں نے کہا کہ ابو الزبیر نے ابراہیم سے روایت نہیں کی ہے، آپ اپنے اصل نسخہ میں دیکھ لیں، جو بات میں کہتا ہوں صحیح ہے، چنانچہ وہ اندر گئے اور باہر آکر کہا کہ کیف ھو ؟ یا غلام! (بچے! یہ سند کیسے ہے ؟) میں نے بتایا کہ یہ سند "الزبیر بن عدی، عن ابراہیم" ہے، یہ سن کر انھوں نے میرا قلم لیا اور اپنی کتاب کی تصحیح کر لی، اسوقت میری عمر گیارہؔ سال کی تھی۔[1]

ابو بکر مدنی کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم لوگ نیشاپور میں اسحاق بن راہویہ کی مجلس درس میں تھے، انھوں نے ایک حدیث بیان کی جسکی سند میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عطاء کیخارانی کا نام تھا۔ ابن راہویہ نے محمد بن اسمٰعیل سے کہا کہ ابو عبد اللہ! یہ کیخارانی کیا ہے؟ محمد بن اسمٰعیل نے بتایا کہ کیخاران یمن میں ایک قریہ ہے، معاویہ بن ابوسفیانؓ نے ایک صحابیٔ رسول کو یمن بھیجا تھا۔ اور ان سے عطار کیخارانی نے دو حدیثوں کا سماع کیا تھا۔ یہ سنکر ابن راہویہ نے کہا کہ ابو عبد اللہ! گویا تم ان حضرات کے ساتھ موجود تھے۔[2]

سلیم بن مجاہد کا بیان ہے کہ میں ایک دن محمد بن سلام بیکندیؒ کی مجلس درس میں ذرا دیر سے پہونچا تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ

لو جئت قبلُ لرأیت صبیاً	اگر تم پہلے آجاتے تو ایک بچے کو دیکھتے جو
یحفظ سبعین الف حدیثٍ	ستر ہزار احادیث زبانی یاد رکھتا ہے۔

[1] تاریخ بغداد۔ ج ۲ ص ۷، [2] ایضاً۔ ص ۸۔

اس کے بعد میں محمد بن اسمٰعیل کی تلاش میں نکلا، اور ملاقات ہونے پر کہا کہ تم ہی کہتے ہو کہ مجھے ستر ہزار حدیثیں یاد ہیں ؟ انھوں نے کہا کہ

نعم، واکثر، ولا اجیئک	ہاں بلکہ اس سے زیادہ اور میں آپکے
بحدیث عن الصحابة	سامنے جن صحابہ یا تابعین کی کوئی حدیث
او التابعین الا عرفت	بیان کروں گا، ان میں سے اکثر کے
مولد اکثرھم ووفیاتھم	موالید وفیات اور مساکن کو جانتا ہوں،
ومساکنھم، ولست	اور صحابہ یا تابعین سے جو حدیث بیان
اروی حدیثاً من حدیث	کرتا ہوں، اس کے بارے میں
الصحابة او التابعین الا	کتاب اللہ یا سنّت رسول اللہ
ولی فی ذلک اصلٌ احفظه	صلی اللہ علیہ وسلم سے میرے پاس
حفظا عن کتاب اللہ	اصل ہے جس کو میں اچھی طرح یاد
او سنة رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	رکھتا ہوں۔

ان واقعات سے بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے کہ امام بخاریؒ حدیث و رجال حدیث میں کس قدر تبحر و تعمق رکھتے تھے۔

التاریخ الکبیر کی تالیف اور اس کی اہمیت

امام صاحب عنفوان شباب ہی میں صاحب تصانیف ہوگئے تھے، یوں تو آپ کی چھوٹی بڑی متعدد تصانیف ہیں، مگر الجامع الصحیح اور التاریخ الکبیر ان میں شاہکار ہیں، اور کئی تذکرہ نگاروں نے ان کا تذکرہ و تعارف صاحب الجامع الصحیح والتاریخ کے لقب سے شروع کیا ہے۔[1] تاریخ کبیر کی جمع و تدوین کی ابتدا اٹھارہؔ سال کی عمر میں

[1] الطبقات الشافعية الكبرى۔ ج ۲ ص ۱۸ ، [2] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۱۳ ابن خلکان ج ۲ ص ۲۸

مدینہ منورہ میں کی، اس کا ذکر خود بڑے والہانہ انداز میں یوں کرتے ہیں۔ جب میں اٹھارہویں سال میں داخل ہوا تو صحابہ اور تابعین کے قضایا و اقوال کی تصنیف و تدوین کرنے لگا یہ امیر عبید اللہ بن موسیٰ کا دور امارت تھا۔ اسی وقت میں نے کتاب التاریخ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قبر شریف کے پاس چاندنی راتوں میں تصنیف کی، تاریخ میں جتنے نام ہیں۔ تقریباً سب کے بارے میں میرے علم میں کوئی نہ کوئی واقعہ ہے، مگر میں نے کتاب کو طول دینا پسند نہیں کیا۔[1]

امام صاحب اپنی عظیم کتاب الجامع الصحیح کی طرح کتاب التاریخ کو بھی بڑی اہمیت دیتے تھے۔ اور اس میں اپنی محنت، کاوش اور مساعی جمیلہ کا اظہار تحدیث نعمت اور بیان واقعہ کے طور پر یوں کیا کرتے تھے۔

لو نشر بعض اسنادی هولاء	اگر یہ لوگ میری بعض سندوں کا پتہ
لم یفهموا کیف صنفت	چلائیں تو نہیں سمجھ سکیں گے کہ میں نے
کتاب التاریخ ولا عرفوه	کتاب التاریخ کیسے تصنیف کی ہے
ثم قال: صنفته ثلاث	اور نہ ہی اس سند کو پہچان سکیں گے۔
مرات۔[2]	میں نے اس کو تین بار لکھا ہے۔

نیز امام صاحب کا قول اپنی دیگر تصانیف کے بارے میں یہی ہے، اسکی صورت یہ ہوئی کہ مدینہ منورہ میں مزار اقدس کے سامنے کتاب التاریخ کی ابتدا کی۔ اور غیر مرتب اور منتشر طور پر موضوع سے متعلق اسماء و تراجم اور معلومات جمع کیں، دوسری بار ان کو حروف تہجی پر ترتیب دیا۔ اور تیسری بار اس کی تبییض کرکے کتاب مکمل فرمائی،

[1] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۳ و ابن خلکان ج ۲ ص ۸ [2] تاریخ بغداد ج ۲ ص، وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۲۱۔

جب ہر اعتبار سے مہذب و محقق ہو گئی تو اوساط دینیہ و علمیہ میں اس کی دھوم مچ گئی حتیٰ کہ ان کے استاد ابن راہویہ نے اس کو فخریہ طور پر امیر بخارا عبد اللہ بن طاہر کے سامنے لیجا کر کہا

ایها الامیر الا اریك سحرا	امیر! کیا میں آپ کو ایک سحر دکھاؤں؟

یہ کہہ کر کتاب اس کے ہاتھ میں دیدی اس نے اس کو دیکھ کر ازراہ تعجب کہا کہ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ محمد بن اسمٰعیل کی تصنیف ہے۔[1]

اور دوسرے امیر بخارا خالد بن احمد ذہلی نے امام صاحب سے الجامع الصحیح اور التاریخ الکبیر کی روایت کی خواہش ظاہر کی۔ اور کہا کہ آپ میرے مکان پر آکر میرے دونوں لڑکوں کو اور بعض روایات میں ہے کہ مجھکو ان دونوں کتابوں کا درس دیں، امام صاحب نے انکار کیا تو کہا کہ اچھا اس کے لیے مخصوص مجلس قائم کریں جس میں ہمارے علاوہ کوئی دوسرا شریک نہ ہو، امام صاحب نے اس سے بھی انکار کر دیا، جس پر امیر خالد بن احمد ذہلی نے ایک فتنہ کھڑا کرکے آپ کو ترک وطن پر مجبور کیا۔[2]

ابو العباس بن سعید نے تاریخ کبیر کی افادیت و اہمیت یوں بیان کی ہے۔

لو ان رجلا کتب ثلاثین	اگر کوئی شخص تیس ہزار حدیثیں لکھے
الف حدیث لما استغنی	تب بھی وہ بخاری کی تاریخ سے بے نیاز
عن کتاب تاریخ محمد بن	نہیں ہو سکتا۔
اسمٰعیل البخاری۔[3]	

ابو احمد حاکم کبیر نے کہا ہے کہ محمد بن اسمٰعیل کی یہ کتاب تاریخ میں پہلی کتاب ہے، ان کے بعد

[1] تاریخ بغداد ج ۲ ص، وہدیۃ الساری ص ۴۸۳، ۲۲۱ وطبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۲۱۔
[2] تاریخ بغداد ج ۲ ص ۳۳ وہدیۃ الساری ص ۴۹۳ نیز موضح اوہام الجمع والتفریق ج ۱ ص ۹ وتہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۸

جس نے تاریخ، اسماء، اور کنیٰ میں کچھ بھی لکھا اس سے مستغنی نہیں ہوا، بعض نے اس کو اپنی طرف منسوب کرلیا جیسے ابوزرعہ رازی، ابوحاتم رازی، اور مسلم، اور بعض نے ان کے حوالہ سے نقل کیا، اللہ تعالیٰ بخاری پر رحمت نازل فرمائے، انھوں نے بنیاد رکھی ہے۔[1]

التاریخ میں امام بخاری کی تین تصنیفات۔

امام صاحب نے کتاب التاریخ کے نام سے تین کتابیں لکھیں (۱) التاریخ الکبیر جو اصل کتاب ہے، اس کی روایت آپ سے ابواحمد محمد بن سلیمان فارس الدلال نیشاپوری، اور ابوالحسن محمد بن سہل فسوی، وغیرہ نے کی (۲) التاریخ الاوسط، اس کی روایت عبداللہ بن احمد بن عبدالسلام الخفاف اور زنجویہ بن محمد اللباد نے کی (۳) التاریخ الصغیر، اس کی روایت عبداللہ بن محمد بن عبدالرحمٰن الاشقر نے کی،[2] آخری کتاب سنین وفات کی ترتیب پر ہے، [illegible] مدت ہوئی الہ آباد میں چھپی ہے، التاریخ الاوسط کا قلمی نسخہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد میں ہے اور التاریخ الکبیر ۱۳۶۰ھ اور ۱۳۷۸ھ کے درمیان شیخ عبدالرحمٰن معلمی یمانی مرحوم کی تحقیق وتصحیح اور تحشیہ کے ساتھ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے چھپ کر آٹھ جلدوں میں شائع ہوئی ہے، کتاب التاریخ کا تتمہ یعنی کتاب الکنیٰ بھی ۱۳۶۰ھ میں یہیں سے شائع ہوئی ہے۔

التاریخ الکبیر کی ترتیب

تاریخ الکبیر میں دس ہزار سے زائد اسماء رجال کا ذکر ہے، جس کا سلسلہ صحابہ سے شروع ہوکر، امام بخاری کے شیوخ پر ختم ہوتا ہے، مطبوعہ نسخہ ابوالحسن محمد بن سہل فسوی کی روایت سے ہے، کتاب کی ابتدا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نسب شریف سے ہوئی ہے، اس کے بعد محمد نامی اشخاص کا ذکر ہے، پھر حروف ہجا کی ترتیب پر اسماء اور ان کے آباء درج ہیں اور ہر حرف کے خاتمہ پر "باب الواحد" اور "من افناء الناس"

[1] طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۲۵ و ص ۲۲۶، [2] ہدیۃ الساری ص ۴۹۲۔

کے عنوان سے اس حرف کے متفرق اسماء رجال ہیں، رُواۃ کی جرح میں شدت احتیاط کی وجہ سے عام طور سے غیر ثقہ اور متروک کے بارے میں "فیہ نظر" "سکتوا عنہ" یا "منکر الحدیث" کے الفاظ ہیں، اور کذاب وضاع وغیرہ کے الفاظ سے پرہیز کیا ہے، فرماتے ہیں کہ مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کی غیبت کے بارے میں مجھ سے محاسبہ نہیں کرے گا۔[1]

حالانکہ متروک اور ساقط راویوں کے بارے میں جرح کے اصطلاحی الفاظ کا استعمال غیبت نہیں ہے، بلکہ بیانِ واقعہ ہے، جو احادیث رسول کی حفاظت وصیانت کے لیے ضروری ہے۔

ذیول

امام بخاری کی الجامع الصحیح کے بعد ان کی التاریخ الکبیر کے ساتھ خصوصی اعتناء کیا گیا، اور بعد کے ائمہ حدیث نے اس کو اصل قرار دیکر اس موضوع پر کتابیں تصنیف کیں، مثلاً مسلم بن قاسم نے ایک مجلد میں اس کا ذیل لکھا، اور حسین بن ادریس ابن خرم انصاری ہروی نے اس کے نہج پر ایک کتاب تصنیف کی، ابواحمد حاکم کبیر نے کتاب الکنیٰ میں اس کے بارے میں جو لکھا ہے، اس وقت ہم التاریخ الکبیر سے متعلق ان علماء ومصنفین اور ان کی کتابوں کا مختصر تذکرہ کرتے ہیں جنھوں نے امام بخاری کے اوہام واخطار کی نشاندہی کرکے ان کی تصحیح کی ہے۔ یا ان کی کتاب سے زیادہ سے زیادہ استفادہ کیا ہے،

۱۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے امام بخاری کے شاگرد امام مسلم کا نام آتا ہے، ابواحمد حاکم نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن دیلمی کی کنیت ابوبسر ہے، اور بخاری ومسلم نے ان کی کنیت ابوبشر (شین معجمہ) بتائی ہے، میرے علم میں دونوں سے خطا ہوگئی ہے، محمد بن اسمٰعیل کو ان کی معرفت حدیث اور جلالت شان کے باوجود اس میں اشتباہ ہوگیا ہے، اور مسلم نے

[1] طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۲۴۔

ان کی کتاب سے اس کو نقل کرکے، ان کی اتباع کی ہے۔ اس کے بعد ابو احمد حاکم نے کہا ہے کہ

ومن تأمل کتاب مسلم فی الاسماء والکنیٰ علم انه منقول من کتاب محمد بن اسمٰعیل حذو القذة بالقذة، حتی لا یزید علیه فیه الا ما یسهل عده، وتجلد فی نقله حق الجلادة، اذ لم ینسبه الی قائله۔[1]

جو شخص امام مسلم کی کتاب الاسماء والکنیٰ کا مطالعہ بغور کرے گا، اسے معلوم ہو جائے گا کہ وہ محمد بن اسمٰعیل کی کتاب التاریخ سے ہوبہو منقول ہے، یہاں تک کہ معدودے چند جگہوں کے علاوہ انھوں نے اضافہ بھی نہیں کیا ہے، اور اس کے نقل کرنے میں پوری جرأت یوں دکھائی کہ اسکی نسبت قائل کی طرف نہیں کی۔

خطیب بغدادی نے اپنی کتاب موضح اوہام الجمع والتفریق میں جس کا ذکر آگے آرہا ہے جگہ جگہ امام مسلم کے اوہام کو امام بخاری کے اوہام کے اتباع کا نتیجہ بتایا ہے۔ واللہ اعلم

۲ - امام عبدالغنی بن سعید مقدسی نے التاریخ الکبیر کے سات اوہام کا ذکر کیا ہے جو ذکر اوہام زعم عبدالغنی انه استدرکها علی البخاری فی التاریخ کے عنوان سے تاریخ کبیر کی آخری جلد (جلد ۴ قسم ۲) کے آخر میں چھ صفحات میں ملحق ہے۔ اور محشی شیخ عبدالرحمن معلمی یمانی نے ہر وہم کے بارے میں تحقیق کرکے بتایا ہے، کہ یہ وہم نہیں ہے، یا ان سے پہلے سے چلا آرہا ہے۔

امام بخاری کے اوہام کی توجیہ | بیشک التاریخ الکبیر کے دس ہزار سے زائد اسماء و تراجم ہیں

[1] طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۲۵۔

کچھ اوہام وخطاء ہیں جو ایک طبعی بات ہے، خاص طور سے جمع وتفریق کے باب میں اس کا وقوع ہوجاتا ہے، کیونکہ بہت سے راویوں کے نام، ان کے آباء کے نام اور ان کے اجداد کے نام ایک ہی ہوتے ہیں، بلکہ بعض اوقات ان سب کی نسبت بھی ایک ہوتی ہے، بعض رواۃ مختلف اوصاف وکنیٰ سے مشہور ہوتے ہیں، بہت سے راویوں کے نام کا رسم الخط ایک اور تلفظ مختلف ہوتا ہے، ان صورتوں میں دس ہزار سے زائد اسماء میں دو یا زائد کو ایک کا اور ایک کو دو یا زائد کا اشتباہ ہوجانا غیر متوقع بات نہیں ہے، پھر تاریخ کبیر تین بار لکھی گئی، اس کے راویوں کے نسخوں میں کچھ نہ کچھ اختلاف رہا ہوگا، اور وراقوں اور ناقلوں سے بھی فروگذاشتیں ہوئی ہوں گی، ان امور کی بنا پر امام بخاری کی کتاب التاریخ میں زیادہ سے زیادہ اوہام کی وجہ سے اسے قابل الزام قرار دینا مناسب نہیں ہے، جیسا کہ ابوحاتم رازی، ابوزرعہ رازی اور خطیب بغدادی نے کیا ہے۔

ابو علی صالح بن محمد کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ ابوزرعہ رازی نے مجھ سے کہا کہ ابو علی! میں نے اسماء الرجال میں محمد بن اسمٰعیل یعنی بخاری کی کتاب التاریخ دیکھی ہے، اس میں غلطیاں بہت زیادہ ہیں، (فاذا فیه خطأ کثیر)، میں نے کہا کہ محمد بن اسمٰعیل کے ساتھ ایک مصیبت یہ رہی ہے کہ علمائے بخارا میں سے جب کوئی عراق سے واپس آتا تھا، اور وہ اس کی کتاب میں کوئی ایسا نام دیکھتے جو ان کو معلوم نہ ہوتا تو اس کو اپنی کتاب میں ٹانک لیتے تھے، اس وقت ان کی کتابیں ان کے پاس نہیں ہوتی تھیں، اور اہل بخارا اپنی تحریروں میں ضبط واتقان کا اہتمام نہیں کرتے ہیں، اور نہ نقطہ لگاتے ہیں، ورنہ میں نے کسی خراسانی عالم کو ان سے زیادہ صاحب فہم نہیں پایا ہے، اگر ان کی زبان میں رکاوٹ نہ ہوتی۔[1]

[1] موضح اوہام الجمع والتفریق ج ۱ ص ، وتہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۵۔

امام بخاریؒ کی طرف سے معذرت اور دفاع کا یہ انداز ان کی جلالتِ شان کے بالکل خلاف ہے، ان کے بارے میں اس قسم کی معلومات فراہم کرکے یہ کہنا کہ

والا فما رأيت خراسانيا افهم منه، لولا لحنٌ في لسانه

ورنہ میں نے کسی خراسانی کو ان سے زیادہ سمجھدار نہیں پایا، اگر ان کی زبان میں ثقل نہ ہوتا۔

یہ دراصل "الذم بما یشبه المدح" کے قبیل سے ہے

۳۔ التاریخ الکبیر کے اوہام پر سب سے مفصل کتاب "بیان خطأ محمد بن اسمٰعیل البخاری فی تاریخہ" ہے، جس کو امام ابو محمد عبد الرحمٰن بن ابو حاتم رازیؒ نے اپنے والد امام ابو حاتم رازی اور امام ابوزرعہ رازی سے سنکر جمع کیا ہے، یہ کتاب ۱۳۸۰ھ میں شیخ عبد الرحمٰن معلمی یمانی کی تصحیح و تعلیق کے ساتھ دائرۃ المعارف العثمانیہ حیدرآباد سے شائع ہوچکی ہے، اس میں امام بخاریؒ کے سات سو اکثر اوہام بیان کئے گئے ہیں، اور بقول محشی ان میں نصف سے زائد تاریخ کبیر میں نہیں ہیں خطیب بغدادیؒ نے اس کتاب کے بارے میں موضح اوہام الجمع والتفریق کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ ابوزرعہ رازی نے بخاری کے جن اوہام کی گرفت کی ہے، ان کو عبد الرحمٰن بن ابو حاتم نے ایک مستقل کتاب میں جمع کیا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ

ونظرت فيه فوجدتُ كثيراً منها لا تلزمه، قد حكى عنه في ذلك الكتاب اشياء هي مدونة في تاريخه على الصواب بخلاف الحكاية عنه؎

میں نے اس کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان میں سے بہت سے اوہام بخاری پر چسپاں نہیں ہوتے ہیں، اور ابن ابو حاتم نے اس کتاب سے ایسی باتیں نقل کی ہیں جو تاریخ بخاری میں ان کے خلاف صحیح طور سے مدون ہیں۔

خطیب کی یہ بات بڑی حد تک درست ہے، مگر خود خطیب نے موضح اوہام الجمع والتفریق میں ابن ابو حاتم سے کئی قدم آگے بڑھکر یہی کام کیا ہے، بلکہ امام بخاری کی جناب میں نامناسب الفاظ استعمال کئے ہیں۔ اس لئے ان کو ابن ابوحاتم کے بارے میں یہ کہنا نہیں چاہئے تھا آگے اس کی تفصیل آرہی ہے۔

اس کتاب کی ابتدا یوں ہے۔

قال ابو محمد عبد الرحمن بن ابي حاتم: سمعت ابي يقول: قال ابوزرعة رضي الله عنهم: حمل الي الفضل بن العباس المعروف بالصائغ كتاب التاريخ ذكر انه كتبه من كتاب محمد بن اسمعيل البخاري فوجدت فيه محمد بن ابراهيم بن سليمان بن سمرة، انما هو محمد بن ابراهيم بن خبيب بن سليمان بن سمرة بن

ابو محمد عبد الرحمٰن بن ابو حاتم نے کہا کہ میں نے اپنے والد کو کہتے ہوئے سنا ہے کہ ابوزرعہ نے کہا کہ فضل بن عباس الصائغ میرے پاس کتاب التاریخ لائے اور کہا کہ انھوں نے اس کو محمد بن اسمٰعیل بخاری کی تاریخ سے لکھا ہے، میں نے اس میں دیکھا کہ محمد بن ابراہیم بن سلیمان بن سمرہ درج ہے، حالانکہ وہ محمد بن ابراہیم بن خبیب بن سلیمان بن سمرہ بن جندب ہے، میں نے اپنے والد ابو حاتم سے سنا کہ ابوزرعہ نے جیسے کہا وہ بھی ویسے ہی

؎ موضح اوہام الجمع والتفریق ج ۱ ص ۸۔

جندب۔ سمعت ابی یقول کما قال [1] کہتے تھے۔

حالانکہ مطبوعہ تاریخ کبیر میں محمد بن ابراہیم بن خبیب بن سلیمان بن سمرۃ بن جندب الفزاری موجود ہے،[2] گویا پہلی ہی گرفت صحیح نہیں ہے، اسی طرح اس کتاب کے بیان کردہ بہت سے اوہام تاریخ کبیر میں نہیں ہیں، عام طور سے ابوحاتم نے ابوزرعہ کی موافقت کی ہے، مگر بعض مقامات میں ان سے اختلاف بھی کیا ہے۔

ابوزرعہ کے سامنے فضل بن عباس الصائغ کا نسخہ تھا، وہ زبردست محدث ہیں ان کے نسخہ میں اغلاط کا احتمال نہیں ہوسکتا ہے الا یہ کہ وہ نسخہ ابتدائی دور کا لکھا ہو یا۔ امام بخاری کے ذاتی نسخہ سے نقل نہ کیا گیا ہو۔ یا اس کا معارضہ و مقابلہ اصل سے نہ کیا گیا ہو اس لئے اس میں غلطیاں تھیں جیسا کہ ابوزرعہ نے جابجا اسکی تصریح کی ہے، اہل علم تاریخ کبیر کے بارے میں بہت محتاط تھے۔ اور اس کے معارضہ و مقابلہ والے نسخہ پر اعتماد کرتے تھے، امیر ابن ماکولا نے اپنے پیش نظر تاریخ کبیر کے نسخہ کے بارے میں الاکمال میں لکھا ہے کہ میں نے اپنی کتابوں میں بخاری کی تاریخ پائی ہے، یہ نسخہ بہت قدیم ہے اسلیم بن سعید وراق نے اس کا معارضہ اصل سے کیا ہے، اور اپنے قلم سے معارضہ کی تاریخ صفر ۳۰۲ھ لکھی ہے۔[3]

ابوزرعہ نے اپنے پیش نظر نسخہ کے اغلاط کی تصریح بعض مقامات میں کردی ہے۔ مثلاً محمد بن عمر بن صالح کے ذکر میں ایک نام عنبس کو ابوزرعہ نے عبیس بتا کر لکھا ہے۔ وانما ھو غلط من الکاتب[4] محمد بن یحیی ابوعبد اللہ ابن ابی عثمان عدنی کو ابن ابی عمر عدنی بتا کر لکھا ہے۔ وھذا غلط من الکاتب۔[5] اسمٰعیل بن عبد اللہ بن زیاد کو عمر بن عبد الرحمٰن

---

[1] بیان خطأ محمد بن اسمٰعیل البخاری فی تاریخہ۔ ص ۳۔ [2] تاریخ کبیر ج ۱ قسم ۱ ص ۲۶
[3] الاکمال ج ۲ ص ۴۲۵۔ [4] بیان خطأ محمد بن اسمٰعیل البخاری فی تاریخہ ص ۸ [5] ایضاً ص ۹

لکھ کر لکھا ہے۔ وھو خطأ من الکاتب۔[1] کتاب میں جگہ جگہ اس قسم کی تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ ابوزرعہ کے نسخہ میں سقم تھا، بہت سے اسماء میں ابوحاتم نے ابوزرعہ سے اختلاف کرکے امام بخاری کو مصیب بتایا ہے، مثلاً ابراہیم بن اسحاق طالقانی کو ابوزرعہ نے ابراہیم بن عیسی بتایا ہے، مگر ابن ابی حاتم نے لکھا ہے کہ

سمعت ابی یقول: ھو ابراھیم	میں نے اپنے والد ابوحاتم سے سنا ہے کہ وہ
بن اسحاق بن عیسی اصاب	ابراہیم بن اسحاق بن عیسیٰ ہیں، بخاری
البخاری۔[2]	نے صحیح بیان کیا ہے۔

ابوزرعہ نے ابراہیم ابوزرعہ کو زرعۃ ابوابراہیم بتایا ہے، مگر ابن ابوحاتم نے بیان کیا ہے کہ

سمعتُ ابی یقول: ھو صحیح،	میں نے اپنے والد کو سنا ہے کہ یہی صحیح ہے
اصاب البخاری ولابراھیم	بخاری نے درست لکھا ہے ابراہیم کا
ابن یقال لہ زرعۃ۔[3]	ایک لڑکا زرعہ تھا۔

اس کی مزید مثالیں موجود ہیں۔

ابوحاتم نے عام طور سے ابوزرعہ کی موافقت کرکے ان کی تصدیق و توثیق کی ہے۔ اور بعض مقامات پر اخطأ البخاری بھی کہدیا ہے، اس کی مثالیں بھی کتاب میں موجود ہیں مگر پوری کتاب میں ایسے الفاظ امام بخاری کے بارے میں استعمال نہیں کئے ہیں جن سے انکے علوے مرتبت پر زد پڑے، یا ان کے مقابلہ میں ادعائیت اور تفوّق معلوم ہو، ابوحاتم اور ابوزرعہ دونوں امام بخاری کے تلامذہ میں سے ہیں، انھوں نے رواۃ و رجال کے اسماء و انساب میں اپنی تحقیق بیان کی ہے، جس کی وجہ سے مشتبہ اسماء وغیرہ نکھر گئے۔

---

[1] بیان خطأ محمد بن اسمٰعیل البخاری فی تاریخہ۔ ص ۱۱ [2] ایضاً ص ۹ [3] ایضاً ص ۹۔

ابو محمد عبد الرحمٰن بن ابو حاتم نے بیان خطأ محمد بن اسمٰعیل البخاری" کی طرح اپنے والد ابو حاتم اور ابو زرعہ کی مجلس درس میں بیٹھکر کتاب الجرح والتعدیل تصنیف کی جس میں اٹھارہ ہزار سے زائد رواۃ حدیث کے بارے میں جرح وتعدیل کی تصریح کی۔ اور تقدمۃ الجرح والتعدیل کے نام سے اس کے مقدمہ کے طور پر ایک مستقل کتاب لکھی، کتاب الجرح والتعدیل اور یہ مقدمہ ۱۳۷۱ھ اور ۱۳۷۳ھ کے درمیان نو جلدوں میں دائرۃ المعارف العثمانیہ سے شیخ عبد الرحمٰن معلمی یمانی کی تصحیح وتعلیق کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ اس کتاب کے بارے میں ابو احمد حاکم کبیر کا بیان ہے کہ میں نے رَے میں دیکھا کہ اہل علم ابو محمد عبد الرحمٰن بن ابو حاتم سے کتاب الجرح والتعدیل پڑھ رہے ہیں، تو ابن عبدوَیہ سے کہا کہ یہ کیا مذاق ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ تم لوگ کھلے طور پر اپنے استاد سے بخاری کی کتاب التاریخ پڑھ رہے ہو، اور اس کی نسبت ابو زرعہ اور ابو حاتم کی طرف کرتے ہو۔ ابن عبدویہ نے جواب دیا کہ ابو احمد! ابو زرعہ اور ابو حاتم کے سامنے جب تاریخ بخاری لائی گئی، تو انھوں نے کہا کہ اس علم سے استغنا نہیں ہے، اور ہمارے لیے زیبا نہیں ہے کہ اس کو دوسرے کی طرف سے بیان کریں۔ اس کے بعد ان دونوں حضرات نے عبد الرحمٰن کو بٹھایا۔ وہ ایک ایک راوی کے متعلق سوال کرتے تھے، اور دونوں جواب دیتے تھے، ساتھ ہی اس میں حک واضافہ کرتے تھے، اس لیے عبد الرحمٰن نے اس کی نسبت ان دونوں کی طرف کر دی۔ [1]

اس واقعہ کو خطیب بغدادی نے موضح اوہام الجمع والتفریق میں بیان کر کے بڑی دلسوزی کے ساتھ لکھا ہے کہ تعجب ہے کہ ابن ابو حاتم نے بخاری کی کتاب پر غارت گری کر کے اس کو اپنی کتاب الجرح والتعدیل میں منتقل کر دیا ہے، اور اس کے اسمار کے متعلق اپنے والد ابو حاتم اور

[1] تذکرۃ الحفاظ ج ۳ ص ۱۰۵۔

ابو زرعہ سے سوال کر کے اس کا جواب جمع کیا ہے، نیز بخاری کے اوہام کا ذکر کیا ہے۔ مگر ابتدا میں کسی قسم کی معذرت نہیں کی ہے، جس سے معلوم ہو کہ ان کا مقصد ان اوہام کی تصحیح ہے، تنقیص اور عیب جوئی نہیں ہے، ویسے ہم گمان نہیں کر سکتے کہ ان کا مقصد دوسرا ہے، کیونکہ عبد الرحمٰن کا دینی مرتبہ بہت بلند ہے، اور وہ اونچے ائمہ مسلمین میں سے ہیں۔ [2]

عبد الرحمٰن بن ابو حاتم کو اتنا بلند مرتبہ امام مسلمین تسلیم کرنے کے باوجود ان کے بارے میں خطیب کا یہ قول بالکل زیب نہیں دیتا ہے، ومن العجب ان ابی حاتم اغار کتاب البخاری۔ یہ درست ہے کہ ابو حاتم اور ابو زرعہ نے التاریخ الکبیر کو اصل الاصول اور ماخذ قرار دیکر امام بخاری کا نام نہیں لیا ہے، مگر اس پر شب خون نہیں مارا ہے۔ التاریخ الکبیر میں دس ہزار سے زائد اسمار ہیں اور کتاب الجرح والتعدیل میں اٹھارہ ہزار سے زائد رواۃ کے نام ہیں، التاریخ میں جرح وتعدیل بہت کم اور محتاط انداز میں ہے، اسی لیے محدثین نے اس کا شمار ان کتابوں میں کیا ہے، جن میں ضعاف وثقات دونوں قسم کے رواۃ ورجال کا ذکر ہے، اور کتاب الجرح والتعدیل کے تقریباً تمام اسمار وتراجم میں اس کی تصریح ہے، جو اس کے نام ہی سے ظاہر ہے۔ دونوں کتابوں میں بڑا فرق ہے۔

کتاب الجرح والتعدیل میں امام بخاری کے نام نہ لینے کی وجہ خود ابن ابو حاتم نے یوں بیان کی ہے،

وقال ابن ابی حاتم: سمع منہ	میرے والد ابو حاتم اور ابو زرعہ نے
ابی وابو زرعۃ ثم ترکا	بخاری سے حدیث کا سماع کیا ہے۔
حدیثہ عند ما کتب الیہما	پھر انھوں نے بخاری کی حدیث کی

[2] موضح اوہام الجمع والتفریق ج ۱ ص ۸۔

محمد بن یحیی انہ اظہر عندھم ان لفظہ بالقرآن مخلوق[1]

روایت بند کر دی جب کہ محمد بن یحییٰ نے ان دونوں کو لکھا کہ بخاری نے لوگوں کے سامنے ظاہر کیا کہ ان کا قرآن کا تلفظ مخلوق ہے۔

امام بخاری اور فتنۂ خلق قرآن اس زمانہ میں خلق قرآن کا فتنہ اپنے حریف کو شکست دینے کا کامیاب ترین حربہ اور بڑے بڑے ائمۂ دین کو مجروح و مطعون کرنے کے لیے موثر پروپیگنڈا تھا، امام بخاری کے خلاف بھی اس کو استعمال کیا گیا۔ صورت یہ ہوئی کہ ایک مرتبہ امام بخاری نیشاپور گئے، اس وقت محمد بن یحییٰ ذہلی کے حلقۂ درس کا عام شہرہ تھا۔ اور ان کے یہاں طلبۂ حدیث کی بھیڑ رہا کرتی تھی، انھوں نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ اس مرد صالح کے پاس جا کر حدیث کا سماع کرو، اس کے بعد امام بخاری کے حلقۂ درس میں اس قدر ہجوم ہوا کہ محمد بن یحییٰ ذہلی کی مجلس میں خلل پیدا ہو گیا، اس پر انھوں نے مشہور کر دیا کہ محمد بن اسمٰعیل کہتے ہیں کہ اللفظ بالقرآن مخلوق (قرآن کا تلفظ مخلوق ہے) نتیجہ یہ ہوا کہ امام بخاری کے یہاں ایک مجمع گیا۔ اور ان سے سوال کیا کہ لفظ بالقرآن کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں، امام صاحب خاموش رہے، دوبارہ سوال پر بھی خاموش رہے اور تیسری مرتبہ سوال کرنے پر کہا کہ

القرآن کلام اللہ غیر مخلوق وافعال العباد مخلوقۃ والامتحان بدعۃ"[2]

قرآن کلام اللہ غیر مخلوق ہے اور بندوں کے افعال مخلوق ہیں، اور اس بارے میں امتحان بدعت ہے۔

اس کے بعد مجمع شور شغب کر کے واپس ہو گیا، جب امام صاحب کے خلاف ہنگامہ

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۲ [2] طبقات الشافعیہ ج ۲ ص ۲۲۸

زیادہ ہوا تو اعلان کیا کہ ۔

من قال عنی: انی قلت لفظی بالقرآن مخلوق، فقد کذب، وانما قلت: افعال العباد مخلوقۃ[1]

جو شخص میرے بارے میں بیان کرے کہ میں نے کہا ہو کہ میرا تلفظ بالقرآن مخلوق ہے، وہ جھوٹا ہے، میں نے صرف یہ کہا ہے کہ بندوں کے افعال مخلوق ہیں۔

امام بخاریؒ کے خلاف اس فتنہ انگیزی کی وجہ سے ان کے دونوں تلامذہ ابو حاتم اور ابو زرعہ نے احتیاط سے کام لیا۔ جیسا کہ کتاب الجرح والتعدیل کے مصنف اور ابو حاتم کے صاحبزادے ابو محمد عبد الرحمٰن بن ابو حاتم نے بیان کیا ہے، ورنہ ان دونوں کو اپنے استاد امام بخاری سے کوئی عداوت یا معاصرت نہیں تھی بلکہ وہ ان کا احترام کرتے تھے، اور امام صاحب بھی اس سے واقف تھے۔

ابو بکر محمد بن حرب کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ میں نے ابو زرعہ سے محمد بن حمید کے متعلق سوال کیا، انھوں نے بتایا کہ ابو عبد اللہ (بخاری) نے اس کو متروک قرار دیا ہے۔ میں نے اس کا تذکرہ بخاری سے کیا تو انھوں نے کہا کہ بتر کہ لنا قدیم" ان کا حسن سلوک ہمارے ساتھ قدیم ہے،

اسحاق بن احمد بن زیرک کہتے ہیں کہ میں نے ایک مرتبہ ابو حاتم محمد بن ادریس کو سنا کہ عراق آنے والے اہل علم میں محمد بن اسمٰعیل سب سے بڑے عالم ہیں، اور ۲۴۷ھ میں ان سے سنا کہ تمھارے پاس خراسان سے ایسا شخص آنے والا ہے کہ وہاں سے اس سے بڑا حافظ حدیث نہیں نکلا ہے، اور چند ماہ کے بعد محمد بن اسمٰعیل تشریف لائے[2]

کسی اہم موضوع کی پہلی اور بنیادی کتاب کو اصل قرار دیکر کتاب لکھنا کوئی

[1] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۴۵ [2] تہذیب التہذیب ج ۹ ص ۵۱۔

معیوب بات نہیں ہے، بہت سے مصنفین نے ایسا کیا ہے، ان میں حک و اضافہ کیا، ان کی
تلخیص کی، اور ان کا انداز ترتیب بدلا، ایسا کرنا عیب نہیں ہے البتہ بلاکسی معقول وجہ کے
اصل مصنف کا نام نہ لینا کسی حال میں اچھا نہیں ہے، اور ایسا کرنے سے کتاب کی افادیت میں
فرق آجاتا ہے۔

۵۔ التاریخ الکبیر کے اوہام میں آخری کتاب خطیب بغدادیؒ کی موضح اوہام
الجمع والتفریق ہے، جو خطیب کی دیگر کتابوں کی طرح نہایت اہم اور مفید ہے۔ اس کا
موضوع جمع و تفریق میں وہم کو بیان کرکے اس کی تصحیح ہے، یہ کتاب بھی ۱۳۷۸ھ اور ۱۳۷۹ھ
کے درمیان دائرۃ المعارف العثمانیہ سے شیخ عبدالرحمٰن معلمی یمانی کی تحقیق و تعلیق کے ساتھ
دو جلدوں میں شائع ہوئی ہے۔

خطیبؒ نے ابتداء میں بخاریؒ، ابن معینؒ، احمد بن حنبلؒ، علی بن مدینیؒ، ابو یوسف
یعقوب بن سلیمان نسویؒ، مسلم بن حجاجؒ، ابراہیم بن اسحاق حربیؒ، ابو داؤد سجستانیؒ، ابوالعباس
احمد بن محمد بن سعید بن عقدہ کوفیؒ۔ ابوالحسن دارقطنیؒ، ابوبکر احمد بن عبدان شیرازیؒ کے اوہام
تفصیل سے بیان کئے ہیں، اس کے بعد ایسے اوہام کا ذکر کیا ہے، جن کے بارے میں علماء
و محدثین کا اختلاف ہے، یہ سلسلہ پہلی جلد میں ۳۶۵ صفحات تک چلا گیا ہے۔ پھر حروف
ہجاء کی ترتیب پر اسماء رجال کے بارے میں اوہام کا ذکر ہے، ان میں سب سے زیادہ التاریخ الکبیر
کے اوہام ہیں، جن کی تعداد چوہتر ہے، مقدمہ میں خطیب نے بڑی شد و مد کے ساتھ
امام بخاری سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے، اور ابو حاتم اور ابو زرعہ کو نشانہ ملامت بنایا
ہے۔ حالانکہ خود انھوں نے کئی قدم آگے بڑھ کر امام بخاری کی جلالت شان کے خلاف الفاظ
استعمال کئے ہیں، اور وہ سب کچھ لکھ گئے ہیں، جس کا ابو حاتم اور ابو زرعہ کو وہم و گمان بھی نہیں

ہوسکتا تھا۔ اور لطف کی بات یہ ہے کہ ان ۴۰، اوہام میں سے بہت کم واقعی اوہام ہیں، جیسا کہ
محشی نے حاشیہ میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

ان کے پیش نظر ابو احمد محمد بن سلیمان بن فارس دلال نیشاپوریؒ کا نسخہ تاریخ کبیر تھا،
ابتداء بطور تمہید کے ابوالحسن دارقطنی کے حوالہ سے امام بخاری کے دو اوہام بیان کرکے لکھا ہے کہ

فی کتاب التاریخ الذی صنفه	ابو عبداللہ محمد بن اسمٰعیل بخاری کی
ابو عبدالله محمد بن اسمٰعیل	کتاب التاریخ میں ابوالحسن دارقطنی
البخاری نظائر کثیرة لما ذکر	کے بیان کردہ اوہام کی بہت سی
ابو الحسن الدارقطنی عنه[1]	مثالیں ہیں۔

ایک جگہ خطیب کے زعم میں امام بخاری نے ایک اسم کو دو سمجھا ہے، اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔

وفصله بین الترجمتین مع هذا	بخاری کا ان دونوں کے درمیان
القول سهو کبیر، واغفال	فرق کرنا بڑی غلطی اور شدید
شدید۔[2]	غفلت ہے۔

اور محشی نے بتایا ہے کہ یہ خود خطیب کا سہو اور اغفال ہے۔

ایک مقام پر لکھتے ہیں۔

والخطأ ایضاً خطأ قبیحاً۔[3]	بخاری نے اس میں بھی قبیح غلطی کی ہے۔

محشی نے لکھا ہے کہ خطیب کے لیے کسی حال میں یہ مناسب نہیں تھا۔ اس جملہ کے
ساتھ ان کا قلم لغزش کرے، بخاری سے وہم و خطا کا صدور نہیں ہوا ہے، بلکہ خطیب کے نسخہ
اور خود خطیب سے خطا ہوئی ہے۔

---

[1] موضح اوہام الجمع والتفریق ج ۱ ص ۵ [2] ایضاً ص ۱۵ [3] ایضاً ص ۵۔

ایک جگہ لکھا ہے. کہ

فقد وضح لذوی التمییز ان	اہل تمییز کے نزدیک واضح ہوگیا کہ
فضل البخاری بین.. خطأ[1]	بخاری کا یہ فرق کرنا خطا ہے.

گویا ذوی التمییز میں امام بخاری نہیں ہیں، ورنہ ان سے یہ خطا نہ ہوتی.

امام بخاری نے مسلم بن خیاط کی کو دوسری جگہ مسلم بن ابی مسلم خیاط کی لکھدیا ہے، اس پر خطیب لکھتے ہیں.

وھذا اطرف الاشیاء من	بخاری کی سب سے زیادہ دلچسپ اور
البخاری ان ذکر ھذا الرجل	مزیدار بات یہ ہے کہ انھوں نے باب الخ
فی باب الخاء تعلقا بنسبته	میں اس شخص کا ذکر خیاطت کی نسبت
الی الخیاطة واعادہ فی	کے تعلق سے کیا، اور پھر اس کا اعادہ
باب المیم لانتسابه	باب المیم میں اس کے والد ابو مسلم کی
الی کنیة ابیه ابی مسلم،	کنیت کی مناسبت سے کیا، بخاری کی
والخطأ فی قوله ھذا ظاھر	غلطی ظاہر ہے اس کی تفصیل کی ضرورت
یغنی عن الاسھاب فیه	نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہماری اور ان کی
واللہ یغفر لنا وله،[2]	مغفرت فرمائے.

خطیب کو بھی اعتراف ہے کہ بخاری نے مسلم الخیاط اور مسلم بن ابی مسلم الخیاط کو ایک ہی شخص مانا ہے، مگر خطیب کے نزدیک یہ طرفہ تماشا ہے کہ بخاری نے اس کو دو جگہ ذکر کیا ہے، حالانکہ بخاری نے اس لئے دو جگہ ذکر کیا ہے کہ وہ اپنے نام اور نسبت سے زیادہ مشہور ہے، اور بعض اوقات صرف اپنے باپ کی کنیت سے یاد کیا جاتا ہے، یہ ان کے ذوق تصنیف کی بات ہے۔

---

[1] موضح اوہام الجمع والتفریق ج ۱ ص ۵۵ [2] ایضاً ص ۱۶۴۔

ظرافہ اور غلطی نہیں ہے، البتہ امام بخاری کی ہجو ملیح ہے، بقول محشی خطیب بغدادی نے اس کتاب میں ائمہ کے اوہام ثابت کرنے کے لئے بعض ایسے راویوں سے استشہاد کیا ہے، جو کذاب و متہم ہیں، مگر اس کو ظاہر نہیں کیا ہے۔[1]

ابو محمد عبد الرحمٰن بن ابی حاتم نے بیان خطأ محمد بن اسمٰعیل البخاری فی تاریخہ میں امام بخاری کے بارے میں تنقیص کا کوئی لفظ استعمال نہیں کیا، اس لئے ابتدا ہی میں معذرت کے الفاظ بیان نہیں کئے. اور خطیب نے جس والہانہ اور عقیدت مندانہ انداز میں معذرت کی ہے، اس کے بالکل برخلاف امام بخاری کی شان میں نامناسب الفاظ استعمال کئے۔ امام ابو حنیفہؒ کے بارے میں خطیب بغدادیؒ کے رویہ کی شکایت کرنے والوں کو امام بخاری کے بارے میں ان کے ان جملوں سے تسلی ہونی چاہئے۔

ہمارے نزدیک امام بخاری، امام ابو حاتم رازی، امام ابو زرعہ رازی، امام ابن ابو حاتم رازی، امام خطیب بغدادی رحمہم اللہ سب ہی ائمۂ دین اور محترم ہیں، ان کی ان کاوشوں سے اسماء الرجال کے بہت سے اوہام و شکوک دور ہوگئے ہیں، اللہ کی ذات کے سوا کون خطا و نسیان اور غلطی سے پاک ہے۔؟

---

[1] مقدمہ موضح اوہام الجمع والتفریق۔ ص ۸۔

نائیجیریا میں تحریک جہاد اور نصب خلافت

۱۸۰۴ء تا ۱۹۰۳ء

از
ڈاکٹر سید احتشام احمد ندوی پروفیسر و صدر شعبہ (عربی) کالی کٹ یونیورسٹی، کیرالا

نائیجیریا آبادی اور ذرائع آمدنی کے اعتبار سے براعظم افریقہ کا ایک اہم ملک ہے اس میں مسلمانوں کی تعداد ۸۰ فیصد ہے، مگر ان کی اکثریت ان کے خاص صوبوں میں ہے، اور دوسرے صوبوں میں عیسائی اور بت پرستوں کی اکثریت ہے، اٹھارہویں صدی عیسوی میں اس ملک میں سات حکومتیں تھیں جو نام کی مسلم حکومتیں کہلاتی تھیں۔ مگر بدعات و خرافات نے دین کی اصل روح غائب کر دی تھی۔ جہالت اور شرک کے اس اندھیرے میں ایک مرد مومن اٹھا۔ اور اس نے اس ملک کی کایا پلٹ دی اس کی صوت ہادی بجلی کا کڑکا بن گئی۔ اس نے اسلام کی ایک نئی لہر پیدا کر کے ہر طرف اس کا بول بالا کر دیا، چھوٹے چھوٹے نواب جو شخصی مفادات کا شکار اور شرک و بدعت میں گرفتار تھے۔ ان کو صاف و پاک کر کے اس مرد مومن نے اسلامی خلافت قائم کر دی جو سو برس پورے آب و تاب سے قائم رہی۔ یہ عظیم شخصیت عثمان بن فودی کی ہے، جن کا تعلق فلانی قبیلہ سے تھا۔ فلانی قبیلہ پورے مغربی افریقہ میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ چرواہوں کا قبیلہ ہے، آج تک اس قبیلہ کے لوگ جانور پالتے ہیں۔ اور اسی سے زندگی گذارتے ہیں۔ ان کا ایک حصہ شہروں میں آباد ہو گیا ہے۔ مگر دوسرا بڑا حصہ خانہ بدوش ہے۔

عثمان بن فودی کی جرأت ایمانی دیکھئے کہ جو قوم بکریاں چراتی تھی اور جانوروں کی

گلہ بانی کرتی تھی، اس کو تخت و تاج کا مالک بنا دیا، اور حکومت و خلافت سے سرفراز کر دیا، جو اعجاز تھا اسلام کے ابدی پیغام کا، حضرت اکبر الہ آبادی نے کیا خوب فرمایا ہے کہ

خود نہ تھے جو راہ پر اوروں کے ہادی بن گئے
کیا نظر تھی جس نے مردوں کو مسیحا کر دیا

اگرچہ خود وہ حج و زیارت کرنے کبھی نہیں گئے، مگر اپنے استاذ شیخ جبریل سے انھوں نے محمد بن عبد الوہاب نجدیؒ کے حالات سنے تھے، حج کی واپسی پر شیخ عثمان بن فودی ان سے ملنے گئے، ان سے وہاں کے حالات معلوم کئے، پھر انھوں نے رد بدعت کے لیے ایک تحریک چلائی، اس تحریک کا نام "الجماعت" پڑ گیا، الجماعت تحریک کے لیے انھوں نے کتابیں لکھیں، ان کی تمام تصانیف عربی زبان میں ہیں، وہ خود، ان کے بھائی شیخ عبد اللہ بن فودی اور ان کے صاحبزادے شیخ محمد بلو سب عربی کے شاعر تھے، اور عربی زبان میں تصنیف و تالیف پر قادر تھے، چنانچہ شیخ عثمان نے رد بدعت پر ایک عظیم کتاب تصنیف کی جس کا نام "احیاء السنۃ و اخماد البدعۃ" ہے، اس کتاب نے نائیجیریا میں بدعت کا قلع قمع کر دیا،

شیخ عثمان نے رد بدعت کے ساتھ ساتھ وعظ کا سلسلہ بھی جاری رکھا، خدا نے ان کے وعظ میں سحر کی تاثیر رکھی تھی، لوگ جوق در جوق ان کے وعظ سننے کو آتے اور وہ دور دور وعظ کہنے نکل جاتے، ایک بار تو تین برس تک گھر نہیں سوئے، اور وعظ ہی میں وقت صرف کرتے رہے، انھوں نے ریاست غوبر میں قیام فرمایا، وہاں پایۂ تخت میں ان کو بڑا اثر و رسوخ حاصل ہو گیا، اور ان کے متبعین کا ایک بڑا حلقہ بھی ان کے گرد جمع ہو گیا، مگر وہاں کے علماء کو ان کی مقبولیت اور بادشاہ غوبر "نفاطا" کے یہاں ان کی عظمت و اہمیت دیکھ کر ان سے حسد ہو گیا، اور بالآخر بادشاہ کو شیخ عثمان سے بدظن کر دیا، اس نے حکم دیا کہ وہ پایۂ تخت کو چھوڑ دیں، مگر اپنے متبعین کو ساتھ نہ لے جائیں، شیخ نے فرمایا کہ ان کو میں کیونکر

منع کر سکتا ہوں، غرض شیخ اپنے ہزاروں مریدوں کے ساتھ غوبر سلطنت کی سرحد پر آگئے، اور ایک گاؤں گڈو (GODU) میں قیام فرمایا، یہاں ان کے متبعین اور مریدوں کی تعداد بڑھتی رہی، جس سے شاہ غوبر خائف ہوگیا، اور کچھ علماء نے بھی اس کو اکسایا، اور اس نے شیخ کی بستی پر حملہ کا ارادہ کر لیا، جب ان کو یہ خبر معلوم ہوئی، اس گاؤں گڈو (GODU) کے گرد خندق کھود کر دیواریں بنا کر حفاظت کا پورا سامان کر لیا گیا، جب بادشاہ یُنْفُ نے حملہ کیا تو شکست کھائی، اور شیخ عثمان کے ہاتھ بہت کچھ مال غنیمت آیا، دوبارہ پھر حملہ کیا، اور شکست کھائی، اب شیخ نے اپنے صاحبزادے شیخ بلو کو غوبر حکومت کے پایۂ تخت پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا، پہلی بار کامیابی نہ ہوسکی، مگر دوسری بار غوبر کا پایۂ تخت فتح ہوگیا، تو بادشاہ نے باقی چھ ملکوں کے بادشاہوں کو مدد کے لیے بلایا[1]، اور ان کو ڈرایا، کہ فلانی قبیلہ کے شیخ عثمان نے ہم کو شکست دیدی ہے، اسی طرح تم کو بھی شکست دے کر تمھارے ملک پر قبضہ کرلیں گے، چونکہ فلانی قبیلہ ہر جگہ پھیلا ہوا تھا، اس لیے ان بادشاہوں نے اس قبیلہ پر ظلم شروع کر دیا، اس کی وجہ سے یہ سب ایک جگہ جمع ہو کر اپنے اپنے ملک میں اپنے بادشاہوں سے جہاد کرنے لگے اور وہ جہاد کا جھنڈا اور اجازت شیخ عثمان کے پاس آکر لے جاتے اور جب موقع شیخ عثمان ان لوگوں کو کمک بھی بھیجدیتے، اس طرح شیخ عثمان کی فوجوں نے سارے ممالک جنکی تعداد سات تھی فتح کرلیے، اور خلافت کا اعلان کر دیا، وہ پہلے خلیفہ اور امیر المومنین قرار پائے، انھوں نے اصحاب لوا کو مجلس شوریٰ میں شامل کیا، جن کو جہاد کے جھنڈے عطا کیے تھے، ان کی حکومت کی بنیاد کتاب وسنت پر قایم ہوئی صرف ایک ملک ان کے ہاتھ سے نکل گیا، یعنی بورنو شیخ محمد امین کانمی نے جنگ کر کے اس کو واپس لے لیا، انھوں نے بعد میں معاہدہ صلح کر لیا،

[1] تفا تا بو ز عا تفا، وہ مر گیا تو اس کا بیٹا ینفا تخت نشین ہوا اس زمانہ میں نائیجریا میں سات سلطنتیں تھیں

اس خطہ کی اسلامی تاریخ میں یہ کوئی معمولی واقعہ نہیں تھا، اس نے اسلام پھیلانے کے سوا اسکی برکتوں سے مغربی افریقہ کے لوگوں کو متمتع ہونے کا موقع عطا کیا، لوگ بڑی تعداد میں اسلام میں داخل ہوئے، اسی انداز سے متعدد اصحاب نے جہاد کیا، اور اسلامی بنیادوں پر حکومتیں قائم کیں، اس وقت نائیجریا میں گہرا دینی جذبہ اور پورے معاشرہ میں اسلامی قدریں جس انداز سے نظر آتی ہیں، اس کی مثال شاید ہی کسی اسلامی ملک میں مل سکے، شیخ عثمان کی تحریک الجماعت نے اس ملک کو اسلام کے نور سے پر نور کر دیا، بدعات کا خاتمہ کر دیا، اور کتاب وسنت کے قوانین کو رائج کر کے سارے علاقہ میں امن وامان قائم کر دیا، شیخ عثمان کی خلافت کے زمانہ میں ایک نیا پایۂ تخت بنایا گیا، جس کو "سکوٹو" کہا جاتا ہے، جو دریائے سکوٹو کے کنارے بسایا گیا ہے،

شیخ عثمان کے ایک شاگرد محمد بن صالح جن کو عالم کہا جاتا ہے، انھوں نے علم جہاد حاصل کر کے یوربا قبیلہ کا رخ کیا، اور وہاں بھی اسلامی حکومت قائم کی، انھوں نے چالیس برس یوربا قبیلہ کے علاقہ میں جہاد کیا، جس سے تقریباً نصف قبیلہ مسلمان ہوگیا، یہ وہی علاقہ ہے جہاں دارالحکومت لاگوس واقع ہے، اور یہیں کہیں حضرت عقبہ بن نافع صحابی کی قبر بھی ہے، حضرت عقبہؓ کی فتوحات دنیا کے عظیم بادشاہوں سے زیادہ بھی نہیں، یہ بھی کہا جاتا ہے کہ سکندر مقدونی سے بڑا رقبہ حضرت عقبہ بن نافعؓ نے فتح کیا تھا، جب سامنے سمندر آگیا تو فرمایا کہ اے خدا جہاں تک تیری زمین تھی میں نے تیرا پیغام تیرے بندوں کو پہونچایا، اور اگر سمندر نہ ہوتا تو وہاں تک تیری راہ میں چلا جاتا، جہاں تک حضرت ذوالقرنین پہونچے تھے، غرض شیخ عالم کا جہاد اس علاقہ میں جاری تھا، اور وہ یوربا قبیلہ سے آگے بڑھ کر ابو قبیلہ کی طرف جہاد کے لیے فوجیں بھیج رہے تھے، کہ انگریز وہاں پہونچ گئے، اور اسلام کا قافلہ ابو قبیلہ تک

تہ پہونچ سکا، میدان خالی دیکھ کر مشنریوں نے اپنا جال پھیلا دیا، اور ابو قبیلہ کو عیسائی بنا لیا، شیخ امین کانمی سلطنت بورنو میں تھے، انھوں نے جنگ کر کے اسے شیخ عثمان کی حکومت سے نکال لیا، اور شیخ عثمان کو کئی طویل خطوط لکھے کہ آپ مسلمانوں سے جہاد کرتے تھے، اور ان کے اندر رائج بعض رسموں کے باعث ان کو مشرک قرار دیتے ہیں، اس کا جواب شیخ عثمان کے ایما سے ان کے صاحبزادے شیخ محمد بلّو نے لکھا، جو بڑے دلچسپ مباحث پر مبنی ہے، میں یہاں ان کے اقتباسات اختصار کے ساتھ پیش کرتا ہوں، سب سے پہلی بات تو شیخ محمد بلّو نے یہ لکھی کہ شیخ عثمان نے اپنی مدافعت میں تلوار اٹھائی، نہ ان کو حکومت کی طلب تھی، اور نہ جنگ کی، مگر جب شاہ غوبر نیف نے ان پر حملہ کر دیا تو وہ کیا کرتے، اور یہی حال ہر جگہ فلانی قبیلہ کے سربراہوں کا ہوا کہ انھوں نے مدافعت میں جہاد کیا، مگر اللہ نے فتح و نصرت سے سرفراز فرمایا، اب شیخ امین کانمی اور شیخ محمد بلّو کے خطوط کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

علامہ محمد امین کانمی کے اعتراضات

امّا بعد فالباعث لرسم هذا المزبور انه لمّا ساقتني المقادير لهذا الاقليم ماوجدت نار الفتن بينكم وبين اهل الوطن موقورة فسألت عن السبب فقيل بغي، وقيل سنة، وتحيرنا في هذا الامر ...... فاخبرونا عن قتالكم لنا واسترقاقكم أحرارنا، ان قلتم فعلنا ذلكم بكم بكفركم فأنا براء من الكفر وبعيدون عن ساحته، فاذا كان اقامة الصّلاة وايتاء الزكاة ومعرفة الله وصوم رمضان وعمارة المساجد كفرًا فما الإسلام؟ واعظم حججكم على تكفير عامّة المسلمين ركوب الامراء بعض المواطن قصدًا للصدقة بها وكشف رؤس الحرائر وأخذ الرشوة واكل مال اليتيم والجور في حكم وكل ذلك من الكبائر التي نهى الله عنها لكن لايكفر احد ان استقر ايمانه بذنب، فلو أمرتم بالمعروف ونهيتم عن المنكر وتركتم الناس حين لم ينتبهوا لكان احسن من هذا القتل

اس خط کو لکھنے کی ضرورت یوں پیش آئی کہ جب اس ملک کی قسمت نے مجھے کھینچا اور میں نے تمھارے درمیان اور اہل وطن کے درمیان فتنہ کی آگ دہکتی ہوئی پائی، تو میں نے اس کا سبب دریافت کیا، کسی نے کہا بغاوت ہے، کسی نے کہا حیلۂ سنت ہے، ہم اس معاملہ میں متحیر رہ گئے ...... ہم کو اپنی جنگ کے بارے میں اطلاع کیجیے کہ آپ کیوں ہم سے جنگ کرتے ہیں اور ہمارے آزاد افراد کو غلام بناتے ہیں، اگر آپ کہتے ہیں کہ تم لوگ کافر ہو تو ہم کفر سے بری اور دور ہیں، اگر نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، خدا کو پہچاننا، رمضان کے روزے رکھنا اور مساجد کو آباد کرنا کفر ہے تو پھر اسلام کیا ہے؟ تمھاری سب سے بڑی دلیل عامۃ المسلمین کی تکفیر میں یہ ہے کہ امراء بعض مخصوص مقامات پر جا کر صدقہ کرتے ہیں، عورتیں اپنے سر کھولتی ہیں، رشوت، یتیموں کا مال کھانا اور حکومت میں ظلم عام ہے، یہ تمام برائیاں بڑے گناہ ہیں جن سے خدا نے منع فرمایا ہے، لیکن ان کے مرتکب کو کافر نہیں کہا جاتا، اگر اس کے اندر ایمان سلامت ہے، تو اگر تم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کام لیتے اور لوگ متنبہ نہ ہوتے جب بھی تم ان کو چھوڑ دیتے تو یہ اس قتل سے بہتر ہوتا۔

اس خط میں علامہ محمد امین کانمی نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ کبیرہ کا مرتکب کافر نہیں ہے،

لوگ بنی امیہ کے زمانہ سے اس طرح کی بدعات میں مبتلا ہیں، مگر ان سے جہاد کر کے ان کو غلام لونڈی بنانا جائز نہیں ہے، باوجودیکہ وہ شریعت پر قائم نہیں ہیں۔

اس کے جواب میں امیرالمؤمنین عثمان بن فودی کے صاحبزادے محمد بلو جو خط لکھتے ہیں، اس میں مجملاً جہاد اور خلافت کی تاریخ پر بھی روشنی ڈالتے ہیں، اور فرماتے ہیں کہ:

واعلم ایھا الکانمی اولاً ما حاربنا الناس بما اجابوك اصلاً، وانما حاربناھم دفعاً عن انفسنا وذریتنا واھلینا لمّا اٰذونا فاغروا بنا سفھاءھم یؤذوننا وینھبون اموالنا ویقطعون طرقنا ونحن نجتھد فی اصلاح دیننا وننشر ما عندنا من العلم من وصل الینا وھذا دأبنا ودأبھم۔

...

فھاجر الشیخ (بجماعتہ) الی موضع یقال لہ "غدو"

اے کانمی! سب سے پہلے تو یہ بات سمجھ لیجیے کہ ہم نے بالکل کسی سے جنگ کا آغاز نہیں کیا، (آپ کو لوگوں نے غلط جواب دیا ہے) ہم نے صرف اپنے اور اپنے اہل وعیال کی مدافعت میں جنگ کی، جب کہ ان لوگوں نے ہم کو تکلیف دی، انھوں نے ہمیں اذیت دینے کے لیے اپنے بیوقوفوں کو ہمارے خلاف اکسایا، ہمارے مال چھین لیے، اور ہم پر ڈاکے ڈالے، جبکہ ہم دینی اصلاح کر رہے تھے، اور اپنا علم پھیلا رہے تھے، ان لوگوں میں (جو حصول علم کے لیے) ہمارے پاس آتے تھے، یہ ہمارا طریقہ تھا، اور یہ ان کا (دشمنوں کا)

(ان حالات میں) شیخ عثمان نے ایک جگہ جس کو گدو (GODU) کہتے ہیں

فلما وصل بھا جعل الناس ممن اٰثروا الاسلام یھاجرون الیہ ارسالاً وان الامیر یتاھب الینا فلما وصل الینا ھزمہ اللہ وتشتت شملہ فقام کل واحد منھم (من ملوك ھاؤسا) علی من ینتسبون الی الشیخ یقتل ویأسر ففرّوا فی البلاد یأوی بعضھم الی بعض حتی صاروا جماعات فجعلوا یدافعون عن انفسھم حتی صار الامر الی ماصار الیہ فی تلك البلاد۔

امّا قولك من اعظم حججکم انّی ولا قال احد بکفرھم فلانعلم دعواك انھم لایریدون بذلك اشراکاً فاذا لم یکن الذبح للاحجار کفراً او شرکاً ضرورۃً فما

وہاں ہجرت کی، اسلام پسندوں نے جماعت بنا بنا کر اس گاؤں کی طرف ہجرت کی، حاکم تیاری کر کے جب ہم پر حملہ آور ہوا تو اللہ نے اس کو شکست دی اور اس کا گروہ منتشر ہوگیا، ہاؤسا کے بادشاہوں نے اپنے اپنے ملک میں شیخ سے تعلق رکھنے والوں کو قتل کرنا اور گرفتار کرنا شروع کر دیا، تو وہ جہاں تہاں بھاگنے لگے، پناہ کے لیے۔ اس طرح ان کے گروہ جمع ہو گئے، اور وہ اپنی مدافعت میں جنگ کرنے لگے، پھر (نصرت و فتح ہوئی) معاملہ وہاں پہونچا اس ملک میں جو آپ کے سامنے ہے۔

آپ کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ ان بدعتیوں کو کسی نے کافر نہیں کہا ہے تو ہم آپ کے اس دعوی پر یقین نہیں کرتے کہ یہ لوگ اپنے ان کاموں سے شرک مراد نہیں لیتے، اگر پتھروں کے لیے ذبح کرنا کفر و شرک نہیں ہے تو پھر شرک کس کو

الشرك، فاذالم یکن الذبح للقبور نفسها اشراکاً فما الاشراك؟

کہتے ہیں؟ اگر قبر کے لیے ذبح کرنا شرک نہیں تو پھر شرک کیا ہے۔

شیخ محمد امین کانمی اور محمد بلّو کی یہ خط و کتابت اسلام میں شرک کی اہمیت اور اس کے بارے میں نقطۂ نظر کے اختلاف کی عمدہ ترجمانی ہے ایک طرف شیخ کانمی فرماتے ہیں کہ بدعت کے مرتکب کو علمائے امت نے کافر و مشرک قرار نہیں دیا ہے، دوسری طرف محمد بلّو فرماتے ہیں کہ قبروں اور پتھروں کیلئے قربانی کرنا اگر شرک نہیں تو پھر شرک کی کیا تعریف ہو سکتی ہے غرض جہاد کی بنیاد دراصل شرک تھا، اور ہاؤسا کے وہ نام کے مسلمان بادشاہ جو قدیم عادتوں کے باعث شرک میں گرفتار تھے، ان سے جہاد کرکے شیخ عثمان، ان کے بھائی شیخ عبداللہ اور صاحبزادے محمد بلّو نے ایک عظیم اسلامی حکومت قائم کر دی جو ایک صدی تک پوری آن بان سے قائم رہی، اور اسی کے اثرات ہیں کہ آج نائیجیریا میں اسلام کا نور چمک رہا ہے، اور ایمان کی شمع روشن ہے۔

مراجع :-

(۱) الاسلام فی نیجیریا، مؤلفہ شیخ آدم عبداللہ اسوری (مطبوعہ قاہرہ، مصر)۔

(۲) الثقافۃ الاسلامیہ فی نیجیریا، مؤلفہ ڈاکٹر علی ابوبکر، طبع اول ۱۹۷۲ء، قاہرہ۔

(۳) عثمان ڈان فوڈیو، مؤلفہ شیہو شگاری ۱۹۷۸ء، لاگوس۔ نیجیریا۔

(۴) عثمان ڈان فوڈیو، تالیف اسماعیل بلوگن، اسلامک پبلیکیشن بیورو ۱۹۷۵ء لاگوس۔

دارالمصنفین کی تاریخ کا تیسرا دور

از

پروفیسر عبداللہ عباس ندوی سابق استاذ ام القریٰ یونیورسٹی مکہ، معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ

سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کی اچانک موت سے حضرت شبلیؒ و سلیمانؒ کی مسند نہیں سونی ہوئی، برصغیر ہند و پاک سے تاریخ اسلام کا ایک ممتاز محقق رخصت ہو گیا، اردو اپنے گوہر شب تاب سے محروم ہو گئی، اخلاق و مروت، حلم و شرافت اور وضعداری و وفاداری کا ایک گراں قدر نمونہ نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

سید صباح الدین صاحب کی موت سے دارالمصنفین کی تاریخ کا دوسرا باب ختم ہو گیا، تاریخ ساز شخصیت علامہ شبلی نعمانیؒ کی تھی، جنھوں نے لکھنے والوں کی ایک جماعت تیار کی ایک مستقر علمی بخشا اور نقشۂ عمل تجویز کیا، دارالمصنفین کو اگر ہم ایک کتاب تصور کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس کا مقدمہ لکھا جس میں پوری کتاب کے مضامین کا نقشہ تھا، (خود ان کی کتابیں قیام دارالمصنفین سے پہلے شائع ہو چکی تھیں) دارالمصنفین کے کام کی ابتدا انھوں نے سیرت نبویؐ سے شروع کی جو اس کتاب کا خاکہ اور مقدمہ تھا، کتاب کا پہلا باب کب اور کن الفاظ سے شروع ہوا، وہ ان کے شاگرد رشید حیات شبلی کے مصنف مولانا سید سلیمان ندوی سے سنیے:

"لیکن آہ! جب ۱۵ر نومبر کی شام کو میں پہونچا تو طاقت جواب دے چکی تھی، میں سرہانے کھڑا تھا میری آنکھوں سے آنسو جاری تھے، انھوں نے آنکھ کھول کر حسرت سے

میری طرف دیکھا، اور دونوں ہاتھوں سے اشارہ کیا کہ اب کیا رہا، پھر زبان سے دوبارہ فرمایا: اب کیا، اب کیا، لوگوں نے پانی میں جواہر مہرہ گھول کر ایک چمچہ پلادیا تو جسم میں ایک فوری طاقت آگئی تو معاہدہ کے طور پر میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر فرمایا: "سیرت میری تمام عمر کی کمائی ہے، سب کام چھوڑ کر سیرت تیار کردو" میں نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا: ضرور! ضرور!

۱۶ر کی شام کو مولانا حمید الدین صاحب بھی تشریف لائے، جن کے لیے مولانا ابتداء سے منتظر تھے، ۱۷ر کی صبح کو مجھے اور انھیں یاد فرمایا، زبان مبارک سے تین مرتبہ سیرت، سیرت، سیرت کہا۔" (حیات شبلی ص ۷۲۴ - ۷۲۵)

"سیرت، سیرت، سیرت" یہ ہے دارالمصنفین کی تاریخ کا آغاز، سیرت نگار نبوی علامہ شبلیؒ کی وفات سیرت طیبہ کے لفظ پر ہوئی، سیرت کی فکر اس درجہ اس لیے تھی کہ نام اد یورپی مورخوں نے جن کو مستشرق کہا جاتا ہے، سیرت طیبہ کو غلط رنگ میں پیش کیا تھا، غلط باتیں آپ کی طرف منسوب کردی تھیں، کیونکہ چاند پر خاک ڈالنا ان کا سرمایۂ ہنر ہے، علامہ شبلیؒ نے اس کام کا بیڑا اٹھایا تھا جو امام بخاریؒ کے لیے احادیث نبویہ جمع کرنے کا باعث ہوا تھا، امام ابن حجرؒ العسقلانی ہدی الساری میں لکھتے ہیں:

روینا بالاسناد الثابتة عن	بوثوق اسناد سے ہمیں محمد بن سلیمان بن
محمد بن سلیمان بن فارس	فارس کی یہ بات پہونچی ہے کہ انھوں نے
قال: سمعت البخاری یقول	کہا کہ میں نے امام بخاری کو یہ کہتے ہوئے
رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم	سنا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
وکاننی واقف بین یدیہ	کو خواب میں دیکھا کہ میں آپ کے روبرو

وبیدی مروحة اذب بہا	کھڑا ہوں، اور میرے ہاتھ میں پنکھا
عنہ، فسألت بعض المعبرین	ہے، جس سے میں آپ سے (غبار یا
فقال لی: انت تذب عنہ	حشرات) دور کررہا ہوں، پھر میں نے
الکذب، فھو الذی	بعض تعبیر دینے والوں سے حقیقت
حملنی علی اخراج الجامع	دریافت کی، انھوں نے کہا کہ تم رسول اللہ
الصحیح۔	صلی اللہ علیہ وسلم سے جھوٹی باتوں کو دور
	کروگے، اور یہی بات تھی جس نے
(ھدی الساری ص ۷)	مجھے الجامع الصحیح مرتب کرنے پر آمادہ کیا

مقصد یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جن غلط باتوں کو منسوب کردیا گیا ہے، ان کی تردید کی جائے، مگر تردید کا سب سے بہترین طریقہ یہ ہے کہ ایجابی طور پر سچ باتیں مرتب کردی جائیں، تاکہ جھوٹ کا خود بخود ازالہ ہوجائے، علامہ شبلیؒ نے یہی طریقہ اختیار کیا جو امام بخاریؒ نے اختیار کیا تھا، لہٰذا بجائے مستشرقین کی تردید کے ایجابی انداز میں سیرت نبویؐ مرتب کرنے کا ارادہ کیا، وہ جس پیمانے پر یہ کام کرنا چاہتے تھے، اس کے لیے ایک اکیڈمی کی ضرورت تھی، دارالمصنفین جس کے نام کا جزو شبلی اکیڈمی بھی ہے؛ اس کے پس منظر میں یہی جذبہ تھا، سیرت کے بعد صحابہ کرام کی سیرت، تابعین کی تاریخ، مسلم حکمرانوں اور ان کے عہد میں انجام پانے والے کارناموں کی تاریخ اور اس ملک میں مسلمانوں کے دور حکومت کی تاریخ یہ سب اس اکیڈمی کا کام قرار پایا، مگر علامہ شبلی کا پیمانۂ حیات لبریز ہوچکا تھا، انھوں نے اس کام کی مبارک ابتدا کی، کام کا نقشہ تجویز کیا، دارالمصنفین کا مادی و علمی ڈھانچہ بنایا، اور دنیا سے کامیاب رخصت ہوکر اپنے مالک حقیقی کی بارگاہ میں سرخرو ہوکر واپس ہوئے،

دارالمصنفین کا پہلا باب اس سیرت کی تکمیل کا تھا، جو ۱۴ رنومبر ۱۹۱۴ء سے شروع ہوا اور مولانا سید سلیمان ندویؒ کے کنارہ کش ہو کر ۱۹۴۶ء میں بھوپال کی روانگی پر ختم ہوا۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ کے بعد ان کا چھوڑا ہوا قلم شاہ معین الدین احمد ندوی نے اٹھایا، سید صاحبؒ کے رفیق و معاصر مولانا عبدالسلام ندویؒ بھی اسی دارالمصنفین میں موجود تھے، مگر وہ صرف ماہر قلم تھے، اور اپنی جگہ پر خود ایک اکائی تھے، مولانا مسعود علی ندوی علامہ شبلیؒ کے پسندیدہ منتظم اور سید صاحبؒ کے دور تک پوری ہمت اور جوش و جذبہ سے اپنے فرائض انجام دیتے رہے، جس میں ان کا کوئی شریک و معاون نہ تھا، مالی استحکام کی فکر، توسیع عمل کی کوشش، انتظامی امور کی دیکھ بھال انھوں نے اپنے سر لے لی تھی، مصنفین، رفقاء اور ان کے علمی سرپرست سید صاحبؒ کو ان امور کی فکر سے مستغنی رکھا، دارالمصنفین کا ایک تہذیبی و ثقافتی معیار قائم کیا، اور ہندوستان کی تاریخ میں دارالمصنفین پہلا ادارہ بن گیا، جہاں کے علماء و محققین نے ثقافت، تہذیب، نفاست پسندی اور ایک صاف ستھری معاشرت کا نمونہ پیش کیا۔

دارالمصنفین کا دوسرا دور جو سید صاحبؒ کے بعد شروع ہوا، وہ اسی ڈگر پر چلتا رہا جو مولانا سید سلیمان ندویؒ اور مولانا مسعود علی ندوی نے اپنے اپنے میدانوں میں پوری جانفشانی اور کوشش سے قائم کیا تھا، شاہ معین الدین احمد صاحب نے اس درجہ اس معیار کو قائم رکھا کہ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ان کو لکھا کہ آپ نے معارف کا وہ معیار قائم رکھا کہ س اور ش (سید صاحبؒ، شاہ صاحبؒ) میں کوئی فرق نہیں کر سکتا، اور اللہ کا شکر ہے کہ میں نے اپنی زندگی ہی میں دارالمصنفین کا وہ نقشہ دیکھ لیا جو میرے بعد سامنے آتا۔

مولانا شاہ معین الدین کی اچانک وفات کے بعد ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شبلی کی بساط قدرت نے ہمیشہ کے لیے اٹھا دی، اب کوئی مجنوں اس صحرا میں نہیں ہے جو قیس علم کی جانشینی کر سکے، یہاں تک

کہ کوئی مشہور عالم دین بھی نہیں رہ گیا، اس لیے مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی کی خدمات حاصل کی گئیں اور سید صباح الدین صاحب نے انتظامات کے ساتھ معارف کی ذمہ داری میں مولانا قدوائی سے تعاون لیا، اور گاڑی اس پٹری سے اترنے نہیں پائی جس پر شروع سے چل رہی تھی، قدرت کو ابھی اور امتحان لینا باقی تھا، مولانا عبدالسلام قدوائی بھی جو ایک ادیب، محقق اور محدث تھے، اچانک وفات پا گئے، اب میدان میں تنہا سید صباح الدین عبدالرحمن تھے، دارالمصنفین کا چراغ زیست آندھیوں کی زد میں تھا، اس مرد خدا نے اس چراغ کی لو قائم رکھنے کے لیے اپنا لہو تیل کی جگہ جلایا، شبلی و سلیمان کا گرتا ہوا قلم اٹھا لیا، تقریباً نصف صدی علماء کا ساتھ، سید صاحبؒ کی صحبت، ان کے درس قرآن میں شرکت اور علمی مجالس میں حصہ لینے کی وجہ سے اور بار بار علمی مراجع کے مطالعہ سے ان کی معلومات اور اسلامی ماخذ پر ان کی نظر عام مولویوں سے کہیں زیادہ تھی، پھر ان کا وسیع مطالعہ سید صاحبؒ کی نگرانی میں کام کرنے کی سعادت حاصل تھی، ایک مجموعی عالمانہ ثقافت کے وہ حامل تھے، مگر ان کے ذمہ دارالمصنفین کے وہ کام بھی تھے جو مولانا مسعود علی ندوی کرتے تھے، اور وہ کام تو تھا ہی جو مولانا سید سلیمانؒ ندوی اور شاہ معین الدین احمدؒ ندوی کے ذمہ رہا، پھر مالی حالت انتہائی نازک ہو چکی تھی، تقسیم ملک کے بعد کتابوں کی نکاسی بہت محدود ہو گئی تھی، پاکستان میں غلط قسم کے ناشروں نے بلا اجازت دارالمصنفین کی کتابیں شائع کرنا شروع کر دی تھیں، سید صباح الدین صاحب کے سامنے تین چیلنج تھے، دارالمصنفین کا علمی وقار قائم رکھنا، اور معارف کا پچاس سالہ معیار باقی رکھنا، دوسرا کام تھا انتظامی امور کی دیکھ بھال، یہ بھی اہم کام تھا، اور مالی استحکام کے لیے کوشش بھی لازمی تھی۔

پہلا محاذ علمی اور قلمی تھا، دیکھنے والوں نے دیکھا کہ سید صباح الدین صاحب کی انگلیوں میں ہلکا سا رعشہ تھا، مگر قلم کی گرفت کبھی ڈھیلی نہیں پڑی، بلکہ محسوس کیا گیا کہ ان کے دست مرتعش میں ایک آہنی پنجہ کا زور تھا، انھوں نے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری کی چار جلدیں تیار کر دیں جو ان کی ساتھ

تالیفات کی طرح اپنے موضوع پر منفرد موضوع ہے، اور کوئی بات تحقیق کی اعلیٰ سطح سے نیچے نہیں اترنے پائی، ان کی آخری کتاب بابری مسجد کی تاریخی حیثیت پر ہے، جو مسلمان لیڈروں سے لے کر عدالت کے وکلاء اور جج صاحبان کے لیے بھی تنہا علمی ماخذ ہے، ان کے دوسرے علمی کارناموں میں بزم تیموریہ ہے، جس کے متعلق ان کے استاد و مربی علامہ سید سلیمان ندویؒ نے تحریر فرمایا تھا:

"خوشی ہوئی کہ تمہاری کامیاب تصنیف "بزم تیموریہ" اہل ذوق کو پسند آرہی ہے، مجھ کو پہلے بزم تیموری پسند نہیں تھی، کیونکہ میں ان کو عیش و تنعم کا دلدادہ، شراب و کباب کا متوالا، حسن و عشق کا پرستار، نقش و تصویر اور سرود و ساز کا دم ساز ہی سمجھتا رہا، لیکن جو تصویر تم نے کھینچی ہے، وہ نہایت عمدہ، اور مصور کے کمالات تعریف کے مستحق ہیں۔"

مولانا ابوظفر صاحب نے لکھا:

"یہ کتاب لکھ کر مغل بادشاہوں کو پھر سے زندہ کر دیا گیا ہے۔"

سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب مرحوم نے ہندوستان کے ملوک یعنی غلام سلاطین و امراء کی اور شاہزادوں کی علمی و دینی تاریخ، علم نوازی اور معارف پروری کی داستان بڑے دلنشین انداز میں پیش کی، دربار سے متصل علماء و فضلاء اور ادباء و شعراء کے کمالات پر اچھا تبصرہ کیا، جس سے کذب و بہتان کا غبار ان کے آئینہ رخ سے دھل گیا۔

اردو تاریخ میں صوفیائے کرام کی تصویر بھی صرف کشف و کرامت کے چوکھٹوں میں بند تھی، معتقدین اور مریدین و متوسلین کو چھوڑ کر عام پڑھے لکھے لوگوں کے ذہن میں ان کا تصور یہی تھا کہ تصوف رسوم کا ایک مجموعہ ہے، لیکن بزم صوفیہ کے مصنف نے ان نفوس قدسیہ کا تذکرہ جس انداز میں کیا اس نے کتاب و سنت پر عمل پیرا ہونے والے مجاہدہ نفس کے تابناک نمونے پیش کر دیے،

غرض علامہ شبلی کی یہ فکر کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم، صحابہ کرام، تابعین اور ان کے بعد کے آنے والے مسلم مفکرین، سلاطین وغیرہ کے متعلق جو غلط روایات منسوب ہیں، ان کو دور کرنے کے لیے ایجابی انداز میں ان کے کارنامے پیش کیے جائیں، اس منصوبے کو علامہ سید سلیمان ندویؒ سے لے کر سید صباح الدین صاحبؒ تک نے ہمیشہ ملحوظ رکھا اور اس انداز کا ایک مفید لٹریچر تیار کر دیا، جس سے کوئی دینی ثقافت کا حامل مستغنی نہیں ہو سکتا، اور اگر اس سے نابلد ہے تو یہ خود اس کا جہل ہے، دار المصنفین کے کام کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔

سید صباح الدین صاحبؒ کی وفات پر دار المصنفین کی تاریخ کا دوسرا باب ختم ہوگیا، اب تیسرا باب آئندہ نسل کا مورخ لکھے گا جس کا عنوان ہوگا "دار المصنفین کا تیسرا دور (سید صباح الدین کے بعد) چونکہ نیت شروع سے خالص دین کی خدمت ہے، اس لیے اللہ کی ذات سے قوی امید ہے کہ وہ اب اور آئندہ بھی کام جاری رکھے اور اس کو ترقی دینے کے اسباب و رجال عطا فرماتا رہے گا، یوں دوام و بقاء صرف حق تعالیٰ جل شانہ کی ذات پاک کے لیے خاص ہے، ہم مولانا ضیاء الدین اصلاحی سے متوقع ہیں اور دعا گو ہیں کہ یہ تیسرا باب کتاب شبلی کا درخشاں ثابت ہو، وما ذلک علی اللہ بعزیز۔

فارم IV

دیکھو رول نمبر ۸

معارف پریس اعظم گڑھ

نام مقام اشاعت :	دار المصنفین اعظم گڑھ	پبلشر :	دار المصنفین اعظم گڑھ
نوعیت اشاعت :	ماہانہ	نام پبلشر :	" "
نام پرنٹر :	عتیق احمد	اڈیٹر :	ضیاء الدین اصلاحی
قومیت :	ہندوستانی	قومیت :	ہندوستانی

نام پتہ مالک رسالہ : دار المصنفین اعظم گڑھ

میں عتیق احمد تصدیق کرتا ہوں کہ جو معلومات اوپر دی گئی ہیں وہ میرے علم و یقین میں صحیح ہیں۔ "عتیق احمد"

جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کی وفات

پر

تعزیتی خطوط

احمد آباد

۹ر دسمبر ۸۷ء

محترمی و مکرمی مولانا اصلاحی صاحب ؛ سلام مسنون

کافی دن کے بعد امریکہ وغیرہ کے سفر سے واپس ہونے پر یہ جگر گداز اور دل سوز اطلاع ملی کہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کسی حادثے کا شکار ہوکر جاں بحق ہوگئے، اور ہم نیازمندوں کو داغ مفارقت دے گئے ہیں، تفصیلات تو ابھی تک معلوم نہ ہوسکیں، میں بتا نہیں سکتا کہ اس خبر نے دل کا کیا حال کر رکھا ہے، اس خبر کو ماننے کو طبیعت بالکل حاضر نہیں ہے، لیکن چونکہ آنکھوں نے اس اطلاع کی مختصر روداد دیکھی ہے، اس لیے ماننے کے سوا چارہ نہیں۔

واقعہ مرحوم عجیب و غریب مرنجاں مرنج، پروقار شخصیت تھے، اسلام آباد اور دہلی میں چند روزہ باہم قیام و طعام کے بعد مجھ پر نہایت کرم فرماتے تھے، ان کا تبحر علم اور انشاپردازی اور خوش علمی گفتگو بے مثل تھا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے، آمین!

دانشمندوں کو ان کے اٹھ جانے سے جو عظیم نقصان پہونچا ہے، اور ہماری علمی دنیا میں جو خلا پیدا ہوا ہے، وہ بیان سے باہر ہے، اب بھی ان کی دلکش تصویر آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے آپ مرحوم کے پسماندگان حضرات اور خواتین کی خدمت میں میری جانب سے تعزیت پیش کریں، خدا انھیں اس جانکاہ سانحہ کے بہت شکن اثرات برداشت کرنے کی طاقت

عطا فرمائے، آمین، والسلام والاکرام

طالب دعا، ضیاء الدین ویسائی

۲۳ر نومبر ۸۷ء

انجمن ترقی اردو ہند۔ نئی دہلی

مکرمی! آداب۔ سید صباح الدین عبدالرحمن کے المناک حادثہ سے جو ذہنی تکلیف اور دلی صدمہ ہوا ہے، اس کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں کہ غم کا اظہار کرسکوں، مرحوم ایک زبردست عالم، ادیب اور دانشور تو تھے ہی، لیکن اس کے ساتھ ہی ایک شریف، مہذب اور ایماندار انسان بھی تھے، میرے حال پر وہ ہمیشہ کرم فرما رہے، اپنے سے کم عمر ادیبوں اور شاعروں کی وہ ہمیشہ حوصلہ افزائی فرماتے تھے، خدا مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، براہ کرم یہ تحریر فرمادیجیے کہ ان کے وارثوں میں کس کو تعزیتی خط لکھا جائے۔

سنا ہے کہ اس رکشہ میں آپ بھی تشریف رکھتے تھے، خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ آپ محفوظ رہے، امید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔

نیاز کیش، خلیق انجم

۲۲ر نومبر ۱۹۸۷ء

کلکتہ

مکرمی مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحی! دامت فیوضہ، سلام مسنون

کل "آزاد ہند" میں مولانا سید صباح الدین صاحب کے حادثۂ جانکاہ کی خبر سن کر ہوش ٹھکانے نہیں رہے، خصوصاً جن حالات میں موت واقع ہوئی انھیں سن کر دل کو بہت قلق ہوا خدا تعالیٰ انھیں جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، افسوس صد افسوس کہ سید صاحب کی

ایک اور یادگار ہم سے چھن گئی۔

دارالمصنفین کے لیے ان کی موت ایک بڑا المیہ ہے۔ میں دارالمصنفین کے رفقاء کے اس غم میں برابر کا شریک ہوں، مولانا مرحوم کے پسماندگان سے میری طرف سے اظہار ہمدردی کر دیجیے، خدا تعالیٰ انھیں اس صدمۂ عظیم کے برداشت کرنے کی توفیق عطا کرے۔

مولانا محمد یحییٰ مرحوم کی دینیات آپ کے پاس محفوظ ہوگی، اسے معارف میں آپ شایع کر سکتے ہیں۔

معارف کا صباح الدین نمبر ضرور نکلے گا، مگر کب تک؟ میرے لایق اگر کوئی خدمت ہو تو تحریر فرمائیے، میری صحت ان دنوں اچھی نہیں ہے، مگر میں اس کام کے لیے ہر طرح کی قربانی کے لیے تیار ہوں، والسلام خیر الختام۔

آپ کا عقیدت مند : مسعود حسن

سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی مولانا آزاد کالج

پٹنہ یونیورسٹی، پٹنہ

۲۷ر نومبر ۱۹۸۷ء

جناب نائب سکریٹری صاحب! السلام علیکم

کل اخبار میں صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے لکھنؤ میں ایک کار ایکسیڈنٹ میں انتقال کی خبر سن کر بہت افسوس ہوا، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

مرحوم سے میں پروفیسر سید حسن عسکری صاحب کے ساتھ اور علیحدہ بھی کئی مرتبہ ملا تھا، بہت شفقت برتتے تھے، وہ محمڈن اینگلو عربک اسکول کے طالب علم رہے تھے، اور گذشتہ سال اسکول کی صد سالہ برسی کے موقع پر میرے اصرار پر انھوں نے سوونیر کے لیے ایک بہت

عمدہ تاثراتی مضمون بھیجا تھا۔

مرحوم کے متعلقین کو میری جانب سے اور پروفیسر سید حسن عسکری صاحب کی جانب سے اظہار تعزیت کر دیں۔ والسلام

قیام الدین احمد

پٹنہ

۲۱ر نومبر ۱۹۸۷ء

مکرمی! السلام علیکم۔ مزاج گرامی

اخبارات کے ذریعہ یہ معلوم کر کے بہت صدمہ ہوا کہ جناب سید صباح الدین عبدالرحمن مرحوم ہو گئے، اللہ ان کی مغفرت فرما کر انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، اور ان کے اعزہ و احباب کو صبر جمیل عطا کرے، آپ سے اور پورے ادارہ دارالمصنفین سے تعزیت کرتا ہوں، مرحوم کے اہل خاندان بالخصوص ان کی اہلیہ محترمہ اور عزیزم شاکر الرحمن تک میری تعزیت اور سلام پہونچا کر شکریہ کا موقع عنایت کیجیے۔

شاید آپ کو معلوم ہو کہ مرحوم نے مجھے علامہ شبلی کی تنقید نگاری پر ایک توسیعی لکچر کی دعوت دی تھی، اور شاید وہ دسمبر کے اواخر میں جلسہ کرنا چاہتے تھے، جس کے لیے میں نے ایک حالیہ خط میں ۲۷ر دسمبر اتوار کی تاریخ بھی تجویز کی تھی، اور مقالہ بھی میں نے تقریباً مکمل کر لیا ہے۔

عبدالمغنی

دہلی یونیورسٹی، دہلی

۱۹ر نومبر ۱۹۸۷ء

محترمی ضیاء الدین اصلاحی صاحب! سلام مسنون

آج صبح کے اخبار نے یہ دردناک خبر سنائی کہ مولانا صباح الدین عبدالرحمن ایک ناگہانی

حادثہ میں ہم سے جدا ہوگئے، انا للہ۔ عالم کی یہ موت شہادت کا درجہ رکھتی ہے، اس سانحہ نے پوری علمی اور ادبی دنیا کو سوگوار کر دیا۔

مجھے تقریباً ربع صدی سے ان کی خدمت میں نیاز حاصل تھا، ان کی محبت، ان کی شفقت، ان کے علم کا انکسار، کس کس بات کو یاد کروں، میں نے ہمیشہ ان کے چہرے پر ایک معصومیت دیکھی جو ولیوں کے لیے مخصوص ہے، میں نے ان کی زبان سے کسی کو برا کہتے نہیں سنا، سید سلیمان ندوی صاحب مرحوم اور شاہ معین الدین ندوی صاحب مرحوم کے بعد انھوں نے جس طرح دار المصنفین کے کام کو سنبھالا، اس نے ادارہ کے وقار کو کم نہیں ہونے دیا۔

ابھی گذشتہ معارف کے شمارے میں "ارمغان فاروقی" پر جو تبصرہ کیا[1] اور میرے اس کام کو سراہا، اس نے میرا حوصلہ بڑھا دیا، اس تبصرہ کی حیثیت میرے لیے سند کی سی ہے، ان کی وفات سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے خاندان کا ایک بزرگ ہم سے جدا ہوگیا، ایسے شخص کی موت معلوم نہیں کتنوں کے لیے سانحہ بن گئی ہے، آپ لوگوں پر کیا گذر گئی ہوگی جو ان کے ہر وقت کے رفیق تھے، جب اتنے فاصلے کے رہنے والے نیازمند اس سانحہ کی شدت سے مضطرب ہیں، ان کی وفات ہی کیا کم درد انگیز ہے کہ سانحہ کی نوعیت نے اس کو اور بھی دردناک بنا دیا۔

ان کی وفات کی خبر سنتے ہی کتنے لوگوں کے ہاتھ ان کی مغفرت کی دعا کے لیے اٹھ گئے ہوں گے، جو ان کی مغفرت کی ضمانت ہیں، بارگاہ رب العزت میں ان کے لیے دعا کرتا ہوں کہ قرب رسول میسر ہو جن کا عشق ان کی زندگی کا ایک حصہ تھا۔

صباح الدین صاحب کے متعلقین تک میرا پیغام تعزیت پہونچا دیجیے، خدا ہم سب کو صبر کی توفیق عطا کرے،

غمزدہ: ظہیر احمد صدیقی

---

[1] یہ تبصرہ راقم کے قلم سے تھا۔ "ض"

الہ آباد

۲۹/۱۱/۸۷ء

محترم مولانا ابو الحسن صاحب! السلام علیکم

سید صباح الدین عبد الرحمٰن صاحب کے حادثہ کی اطلاع مجھے اس وقت دہلی میں ملی جبکہ میں خود زیر علاج تھا، ان کے اچانک اس دنیائے فانی سے اٹھ جانے سے علمی دنیا میں ایک کمی پیدا ہوگئی ہے، اور ملت اسلامیہ نے ایک قابل اعتماد مورخ اور مفکر کھو دیا ہے۔

انھوں نے دار المصنفین شبلی اکیڈمی کو ایسی کٹھن منزل سے نکالا جس کا حل کوئی معمولی کام نہ تھا، انھوں نے ادارہ کی بین الاقوامی ساکھ کو برقرار رکھا، اور ان کی تصانیف نے عالمی شہرت حاصل کی، اور خاص کر دار المصنفین کا ادبی رسالہ "معارف" اپنی خصوصیات کی وجہ سے پوری اسلامی دنیا میں مقبول ہے۔

میرے پاس الفاظ نہیں کہ میں اپنے والد مرحوم کے اس بے تکلف دوست کے سفر آخرت پر اپنے اس غم کا اظہار کر سکوں جو میرے دل کی گہرائیوں تک مجھ پر چھا گیا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے میری دعا ہے کہ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ جگہ عطا فرمائے، اور جملہ متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین۔

شریک غم خاکسار سلیم شیروانی

انجمن اسلام بمبئی

۲۷ر نومبر ۸۷ء

جناب مخدومی و معنوی صاحب! سلام مسنون

لکھنؤ کے حادثہ کی خبر "اخبار عزائم" سے ملی، شبلی و سلیمان کے جانشین ممتاز محقق اور مصنف دار المصنفین کے سربراہ سید صباح الدین عبد الرحمٰن کی وفات پر سخت رنج ہوا۔

وہ ادارہ کی روح رواں تھے اور نازک ترین وقت میں اس کو حوادث وآفات سے بچاتے ہوئے اس کے علمی وتحقیقی وقار کو برقرار رکھا تھا۔

ان کی وفات حسرت آیات دراصل موت عالم ہے، خدا مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے،

ہم اللہ کے شکر گذار ہیں کہ آپ بال بال بچ گئے، اللہ بڑا محافظ ہے، اللہ آپ کو صحت وسلامتی عطا فرمائے، (آمین) انجمن اسلام اور میں آپ کے اس غم میں برابر کے شریک ہیں یہ مسلمانان ہند اور زبان وادب کا نقصان ہے۔

سوگوار محمد اسحٰق جمخانہ والا صدر انجمن اسلام بمبئی[1]

اصلاحی دوا خانہ، فیضی محل، بمبئی ۳ر دسمبر ۱۹۸۷ء

برادر عزیز! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

خدا کرے آپ مع متعلقین بخیر ہوں، میں تقریباً ایک ماہ کے بعد دہلی ہوتے ہوئے بمبئی پہونچا، دو دن کے بعد پھر مالیگاؤں جانا پڑا، وہاں سے واپس آیا تو مولانا مستقیم صاحب نے سید صاحب کے دلدوز حادثہ کی اطلاع دی، دل پر کیا گذری، بیان نہیں کر سکتا، ابھی چند دن پہلے صبر جد میں ان کی گل افشانی گفتار کی یاد آتے ہی طبیعت بے چین وبے قرار ہوگئی، جس کے زور قلم نے نہ جانے کتنے تاریخی معرکے سر کیے، اور جس کی علمی، ادبی اور تاریخی خدمات اتنی طویل اور عظیم ہیں کہ بآسانی اس کا اظہار نہیں کیا جا سکتا، افسوس کہ یہ طوطیٔ خوش بیان اب ہمیشہ کے لیے ہم سے جدا ہوگیا، یہ سانحہ ذاتی بھی ہے اور قومی وملی بھی، اس قحط الرجال میں اب ان کی جگہ پر ہونا

[1] جناب عبد المجید پاتکا، جنرل سکریٹری انجمن اسلام بمبئی کا بھی اسی مفہوم کا خط موصول ہوا تھا۔ "ض"

بہت مشکل ہے، اللہ تعالیٰ ان کی قبر کو منور اور خوشنودی کی جنت نصیب فرمائے، اور پسماندگان کو صبر جمیل۔

بڑا مسئلہ دار المصنفین کا ہے، دعویدار تو بہت ہیں، لیکن اس خلاء کو صحیح ڈھنگ سے پر کرنے والا بظاہر نظر نہیں آتا، خدا کرے منتظمین نعم البدل نہ سہی کوئی بدل ہی ڈھونڈنے میں کامیاب ہو جائیں، اللہ تعالیٰ دار المصنفین کی حفاظت فرمائے، اور اس کی عظمت اور وقار کو قائم رکھے، آمین۔

خیر اندیش: (حکیم) مختار اصلاحی

ذاکر نگر، جامعہ نگر، نئی دہلی جمعرات ۱۹ر نومبر ۱۹۸۷ء

مخدومی ومعظمی[1]! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ۔

کل رات میں ٹیلیفون کے ذریعہ اور آج صبح کو قومی آواز کے ذریعہ جناب سید صباح الدین صاحب کے دردناک حادثہ کی اطلاع ملی، اس کا دل ودماغ پر جو اثر پڑا، وہ ناقابل بیان ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون، اللہ تعالیٰ اپنی نوازشوں اور رحمتوں سے نوازے، آمین۔

اس حادثہ کی وجہ سے مرحوم کی عاقبت تو سنور گئی، مگر دار المصنفین یتیم ہوگیا، جن بزرگوں نے خون پسینہ ایک کرکے اس کو تعمیر کیا تھا اور اپنی مخلصانہ کوششوں سے اس کو بام عروج پر پہونچایا تھا مرحوم ان کی آخری نشانی تھے، اب ان کا نعم البدل ملنا تو بظاہر مشکل بلکہ ناممکن ہے، لیکن اللہ کی رحمت سے بعید نہیں کہ ایک ایسا بدل عطا فرما دے، جو نہ صرف دار المصنفین کو موجودہ مجدھار سے

[1] یہ خط جناب مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کے نام ہے، مکتوب نگار نے راقم کو بھی اسی مفہوم کا خط لکھا تھا۔ "ض"

نکالنے میں کامیاب ہوجائے، بلکہ اس کے سابق رفقائے محترم نے جو اس کو ملک گیر شہرت عطا کی تھی اس کو برقرار رکھے۔

سید صاحب مرحوم کی سرپرستی اور رہنمائی سے محروم ہونے کے بعد دارالمصنفین پر ابتلاء و آزمائش کے نہ جانے کیسے کیسے دور آئے، اور نہ جانے کن کن مصائب و مشکلات سے وہ دوچار ہوا، مگر آپ کی سرپرستی اور رہنمائی کی برکت سے اس کا سفر کامیابی سے جاری رہا، مگر اس جانکاہ حادثہ کے بعد آپ کی ذمہ داریوں میں کئی گنا اضافہ ہوگیا ہے، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے نیک اور مخلص بندوں کی ہمیشہ مدد کرتا ہے، اس لیے امید ہے کہ اپنی خرابیٔ صحت اور گوناگوں مصروفیتوں کے باوجود آپ اس بوجھ کو جو یکایک آپڑا ہے، آسانی سے اٹھالیں گے، اس قحط الرجال کے زمانہ میں اللہ کے بعد آپ ہی سے تمام توقعات وابستہ ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کو عمر دراز عطا فرمائے، آمین، والسلام

آپ کا خادم : عبداللطیف اعظمی

علی گڑھ ۱۹ نومبر ۸۷ء

عزیزم مولوی ضیاءالدین، السّلام علیکم، آج قومی آواز کے پہلے صفحہ پر یہ دردناک خبر نظر پڑی کہ محترم صباح الدین صاحب ٹرک کے حادثہ میں ندوہ کے راستہ میں شہید ہوگئے (انا للہ وانا الیہ راجعون)۔ یہ خبر پڑھ کر دل و دماغ اس قدر پریشان ہیں کہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا کہوں۔ کل ہی میری آنکھ کا آپریشن ہے، لیکن اس خبر نے مجھے اس قدر متوحش کر دیا ہے کہ کسی سے بات بھی کرنے کا جی نہیں چاہتا۔

نہ جانے اس منحوس خبر سے آپ لوگوں پر کیا گذری ہوگی، اور ان کے بچوں کے لیے

قیامت نہ ٹوٹ پڑی ہوگی۔

اللہ پاک آپ سب پر اور ان کے متعلقین پر رحم فرمائے، ہم سب آپ سب کے غم میں شریک ہیں، یہ حادثہ ہمارے لیے بھی اتنا ہی جانکاہ ہے جتنا آپ لوگوں کے لیے۔

اللہ پاک مرحوم کو شہیدوں کی صف میں شامل فرمائے، اور جنت میں ابدی راحت و سکون عطا فرمائے۔ آمین۔

مرحوم کی اہلیہ اور بچوں کو میری طرف سے پرسہ دیجیے۔

آپ کا : محمد معظم جیراج پوری

---

۲۲ نومبر ۸۷ء

معہد طبی اکاڈمی، بہار، پٹنہ

محترم نائب مہتمم صاحب دارالمصنفین اعظم گڈھ

صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب لکھنؤ میں ۱۸ نومبر ۸۷ء کو حادثہ کا شکار ہوگئے، اور ملک الموت نے ان کو گود لے لیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، یہ حادثہ اردو، علمی، ادبی، تحقیقی اور تاریخی دنیا کا معمولی حادثہ نہیں عظیم حادثہ ہے، اس پر جتنا بھی ماتم کیا جائے کم ہے، محققین کی پیداوار میں آج کل جو اضافہ ہو رہا ہے، اس نے تحقیق کی روح کو زخمی کر دیا ہے، بلند پایہ محققین میں مرحوم کی ذات کو صف اول میں شمار کیا جا سکتا ہے، ان کے کام ان کو ہمیشہ زندہ رکھیں گے، دارالمصنفین کو ان جیسا مخلص کارکن نصیب ہو جو نعم البدل ہو سکے۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمادے اور جنت الفردوس عطا فرمادے، سفر میں حادثہ اور موت، شہادت کی ضمانت ہے، اہل و عیال کو صبر کی توفیق عطا کرے۔

شریک غم : عبدالاحد عفی عنہ

انڈین انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز

تغلق آباد نئی دہلی

۲۴ر نومبر ۱۹۸۷ء

مکرمی ومحترمی! تسلیم۔ امید ہے آپ لکھنؤ سے لوٹ آئے ہوں گے، مجھے اس حادثہ کی تفصیل آپ سے سننے کی خواہش ہے جس میں ہمارے کرم فرما اور بے مثل ادیب و دانشور جناب سید صباح الدین عبد الرحمن صاحب ہلاک ہوئے، میں نے سنا ہے کہ آپ بھی انکے ساتھ تھے، اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ اس نے آپ کو ہر طرح محفوظ رکھا، اب آپ کی یاد تیز ہوگئی ہے، اور ہم سب آپ سے ملنے کے منتظر ہیں، دلی کا پروگرام بنایئے، تاکہ ملاقات ہو، میں آج ذات امریکہ جارہا ہوں، دوسری دسمبر کو خدا نے چاہا تو واپس آجاؤں گا۔

منسلک خبر آپ کے لیے دلچسپ ثابت ہوگی۔

گھر میں سب کو ہمارا اسلام پہونچائیں، والسلام

آپ کا: اوصاف علی

۱۷ر جنوری ۱۹۸۸ء

محترمی! السلام علیکم۔ صباح الدین صاحب کے انتقال پر اظہار افسوس کرتا ہوں، ایسے ادبی اصحاب جو مشرقی علوم سے بھی بہرہ ور ہوں، دن بدن کم ہوتے جارہے ہیں، ایسے ادبی اصحاب جنکو علم کا کام کرنے کی بے پناہ لگن ہو خال خال ہیں، اس اعتبار سے صباح الدین صاحب کی رحلت ایک سانحہ ہے، اللہ تعالیٰ انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ آمین

احقر سید لطیف حسین ادیب

اردو اکادمی، دہلی

۳ر دسمبر ۱۹۸۷ء

فائل نمبر ۶(۱)/۸۷/یو۔اے/۳۸۰۰۱

محترمی! تسلیم۔ آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا، اللہ تعالیٰ مرحوم ومغفور کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے، اور تمام لواحقین کو صبر جمیل عطا کرے۔ آمین۔

مولوی صاحب کے انتقال کی خبر ڈاکٹر خلیق انجم صاحب کی زبانی ۱۸ر نومبر کو ہوگئی تھی، اکادمی میں ایک تعزیتی جلسہ ہوا اور قرارداد پاس ہوئی، بعدازاں دفتر کی چھٹی کردی گئی۔

ایک طرف مولانا کے انتقال سے ہم ان کی دعاؤں سے محروم ہوگئے تو دوسری طرف اردو زبان و ادب بھی اپنے بے لوث خادم سے محروم، اب کون ہے جو ہمیں بھلی بری باتوں سے روکے گا، اور کون ہے جو ہماری اصلاح کرے گا، اللہ تعالیٰ مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔

نیازمند، سید شریف الحسن نقوی سکریٹری اردو اکادمی دہلی

سری نگر، کشمیر

۲۴ر نومبر ۱۹۸۷ء

دور حیات ہستی آخر شود ولیکن — نبود بقائے جاں را ہرگز فنائے دوراں

ادبار ہستی ما شد پردہ اے جالش — ورنہ ز راہِ تحقیق خورشید نیست پنہاں

محترمہ عزیزی بھابی صاحبہ! اسلام مسنون، کل ایک مقامی اخبار میں یہ حسرت بھری خبر پڑھی کہ آپ کے نامور شوہر میرے پیارے دوست صباح الدین صاحب واصل بحق ہوئے، آسمان سے خون کیوں نہیں برسا، زمین پھٹ کیوں نہیں گئی، یہ رنج دہ خبر سن کر میرے دل پر خنجر سا لگا، اور میں مبہوت ہوگیا، آس پاس بیٹھے ہوئے افراد خانہ نے تسلی دی، بے شک ہم اللہ کی طرف سے

یہاں آتے ہیں، اور بے شک اسی کی طرف لوٹ کے جانا ہے زندگی کا دور ختم ہوگا، لیکن جان کی بقا کو دور فنا نہیں کرتا، میرا عزیز دوست رحمت پروردگار کے سایے میں آسودہ ہوگا، ہمیں تڑپتا چھوڑ کر وہ خالق حقیقی سے جا ملا، اسے کیا معلوم یا شاید معلوم ہوگا کہ ہم پر کیا بیت رہی ہے، اس کی غیر موجودگی میں، ہم اس کی جدائی میں کیسے طوعاً و کرہاً زندگی بسر کر رہے ہیں، مگر وہ ہمیں دلاسا نہیں دے سکتا نہ ہمیں تسلی دے سکتا ہے، وہ تو رحمت پروردگار میں اعلیٰ علیین پر فائز ہو گیا اور اس دنیائے دوں سے کنارہ کش ہو گیا، اللہ اسے زیادہ سے زیادہ عنایات سے نوازتا رہے اور اس کے طفیل ہمیں صبر عطا کرے۔

میری اہلیہ اور میں آپ کے غم میں شریک ہیں، میں خود سوگوار ہوں، جیسے میں اپنے کو تسلی دے رہا ہوں ویسے آپ سے بھی درخواست ہے کہ اس غم انگیز سانحۂ عظیم پر اپنے کو تسلی دیں، اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دیں، حالانکہ تعلق خاطر اور صبر کے درمیان ہزار فرسنگ ہے، لیکن صبر کرنے کے سوا اللہ کی رضا کے آگے سر تسلیم خم کرنے کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے، سچ کہا گیا ہے

عشق کچھ محبوب کے مرنے سے مر جاتا نہیں   روح میں غم بن کے رہتا ہے گزر جاتا نہیں

یہ غم آپ کی روح کی آسودگی اور دل کی قوت کے لیے درماں ہے، عزیزوں کو تسلی دیں، اللہ آپ کو اپنے نامدار شوہر کے خاندان کی سرپرستی کرنے کی توفیق اور ہمت بقدر وافر عطا فرمائے۔

میرے نام کوئی حکم ہو تو بلا چون و چرا ارشاد کیا کیجیے، جیسے میرے عزیز مرحوم دوست عنایت کیا کرتے تھے، ہمارے مابین تعلق خاطر قائم ہے، والسلام

سوگوار: محمد امین بچھ

بیت الرشاد، نیا کریم گنج، گیا   ۲۱ر نومبر ۸۷ء

مکرمی! السلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ اخبارات سے یہ افسوسناک اطلاع ملی کہ جناب

سید صباح الدین عبدالرحمن صاحب کا ایک ایکسیڈنٹ میں اچانک انتقال ہو گیا، انا للہ وانا الیہ راجعون، ملک کے علمی و دینی حلقوں کے لیے عموماً اور دارالمصنفین کے لیے خصوصاً یہ ایک بڑا حادثہ ہے، اور یہ ایک ایسا علمی خلا ہوا ہے جس کا پُر ہونا مشکل ہے، مرحوم دارالمصنفین اور دبستان شبلی و سلیمان کے آخری یادگار تھے، ایک عہد ختم ہو گیا، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت فرمائے اور اپنے جوار رحمت میں جگہ دے، تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے، ان کے اہل خانہ کو میری طرف سے تعزیت فرما دیں، میں ان کے غم میں برابر کا شریک ہوں، والسلام

مخلص طیب عثمانی

کیفی منزل، جھنجھری روضہ، کاکوری، لکھنؤ

مکرم و محترم اصلاحی صاحب! تسلیم عرض

بڑا سخت حادثہ ہے، جس وقت خیال آتا ہے چوٹ سی لگتی ہے، میں علیل تھا، مجھ سے چھپایا گیا، مجھے دوسرے دن معلوم ہوا، نماز ہی میں شرکت ہو جاتی، اس کا غم ہے، خدا کرے یہ باغ خوب پھلے پھولے، آمین، اور آپ لوگ سنبھال لے جائیں۔ ثم آمین۔

احقر معین احمد علوی

۲۳ر نومبر ۸۷ء   رام پور رضا لائبریری رام پور

محترمی و مکرمی۔ تسلیم مع التکریم ــــ کل دہلی کے ایک اخبار سے صباح الدین عبدالرحمن صاحب کے حادثۂ فاجعہ کی اندوہناک خبر ملی انا للہ وانا الیہ راجعون، بہت دکھ ہوا، مرحوم نے اردو اور تاریخ اسلامی ہند کی جو خدمت اپنے قلم سے

کی، اور جس طرح سالہا سال معارف کے معیار کو بلند رکھنے میں کاوش و سعی کی، وہ ان کی یاد دلوں میں برقرار رکھنے کے لیے کافی ہے، اور پروردگار عالم کے حضور بھی وہ ماجور ہوں گے، ایسے قومی حادثوں کا بدل نہیں ہوا کرتا، ان کی وفات ہمارا ناقابل تلافی نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کو درجات بلند سے نوازے اور آپ کو اور ہمیں صبر عطا فرمائے۔ آمین۔

شریک غم اکبر علی خان عرشی زادہ

سری نگر، کشمیر

۲۶ نومبر ۱۹۸۷ء

صاحبزادۂ محترم زید لطفہٗ سلام مسنون، نیاز مقرون

اخبارات کے ذریعہ قبلۂ محترم جناب سید صباح الدین عبد الرحمٰن مرحوم مدیر 'معارف' کے اچانک سانحہ ارتحال کی خبر پڑھ کر بے پناہ دکھ اور دلی صدمہ ہوا، یہ علمی اور ملی سانحہ صرف پسماندگان ہی کے لیے نہیں ہے، بلکہ سید صاحب کے ہزاروں پرستاروں کے لیے بھی ہے، اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت نصیب فرمائیں، اور آپ سب حضرات بشمول کارکنان و رفقائے دارالمصنفین کو صبر جمیل کی توفیق، ہماری طرف سے تعزیت مسنونہ قبول فرمائیے۔

سید صاحب مرحوم کی دینی، علمی، تحقیقی اور تاریخی ٹھوس حیثیت، تعمیری اور سنجیدہ خدمات ملت کے لیے سب سے بڑا سرمایہ اور موصوف کے لیے زاد آخرت ہے، بلاشبہ ملت ایک نامور محقق، مایۂ ناز ادیب، اسلامی مفکر، دانشور اور محب وطن سے محروم ہو گئی۔

جناب میر واعظ کشمیر مولانا محمد فاروق صاحب کو بھی ذاتی طور سے اس حادثہ سے بیحد دُکھ پہونچا ہے، موصوف کی طرف سے بھی تعزیت قبول فرمائیں۔ والسلام مخلص محمد سعید الرحمٰن شمسی

مدیر نصرۃ الاسلام، کشمیر

ادبیات

حمد

از جناب فضا ابن فیضی صاحب، مئوناتھ بھنجن

نظر شگفتہ، دل آسودہ، جان روشن ہے
ترے چراغ سے سارا امکان روشن ہے

شفق شفق ہیں مکاں، لامکاں یوں تجھ سے
ازل کی خاک ابد کی چٹان روشن ہے

تجھی سے گرم ہے امکان و عرش کا پہلو
یقیں کا شعلہ ہے زندہ، گمان روشن ہے

طلسمِ شب بھی ترا، عشوۂ سحر بھی ترا
گھنی ہے چھاؤں مگر سائبان روشن ہے

یہ مہیب سمندر، مگر کرم تیرا
ہوا ہے شمع بکف، بادبان روشن ہے

تو آئنہ بھی ہے، چہرہ بھی، عکسِ لرزاں بھی
جہت جہت سے مکاں لامکان روشن ہے

ہیں تیرے ترکشِ قدرت میں کس غضب کے تیر
کہ ہفت رنگ دھنک کی کمان روشن ہے

لکھا ہے جس کو ترے خامۂ مشیّت نے
ورق ورق وہی اک داستان روشن ہے

وہ طور کا ہو شجر، یا حرا کے برگ و ثمر
چمن چمن، نفسِ باغبان روشن ہے

عصائے نیل شکن ہو کہ دستِ ماہ شگاف
کوئی زمین ہو، ترا آسمان روشن ہے

شہود و غیب کے اسرار ہیں کہ پرتو زار
کہ بے چراغ بھی ہر شمع دان روشن ہے

تری کشش بنی معراج کا بہانہ مجھے
یہ کس بلندی پہ تیرا نشان روشن ہے

اک اعتراف ہے شانِ الوہیت کا تری
مرے لبوں پہ جو حرفِ اذان روشن ہے

محمدِ عربی ہوں کہ جبرئیل و خلیل
ترے کلام سے سب کی زبان روشن ہے

یہ وصف بے ہنری، لکھ رہا ہوں حمد تری
قلم ہے خوشہ پروین، بیان روشن ہے

رباعیات[1]

از جناب علقمہ شبلی صاحب کلکتہ

(۱)

تاریخ کے چہرے کو نکھارا جس نے
تحقیق کے گیسو کو سنوارا جس نے
افسوس قلم کا وہ سپاہی نہ رہا
تہذیب کا ہر نقش ابھارا جس نے

(۲)

عرفان کے چہرے کی لہک تھا، نہ رہا
ایقان کے ہونٹوں کی چٹک تھا، نہ رہا
برسوں اسے ڈھونڈیں گی نگاہیں شبلی
ادراک کی آنکھوں کی چمک تھا، نہ رہا

(۳)

تصویر وفا، خُلق کا پیکر تھا جو،
شائستہ بیانی کا مقدر تھا جو،
شبلی و سلیماں کا وہ وارث نہ رہا
دریائے معارف کا شناور تھا جو

(۴)

پھر آج ہے فق چہرۂ علم و عرفاں
پھر آج ہوئے لوح و قلم نوحہ کناں
ہے سوگ صباح قلم آرا کا یہ
پھر آج سیہ پوش ہے بزم ایماں

[1] جناب سید صباح الدین عبدالرحمن کی رحلت پر ایران سوسائٹی کلکتہ کے جلسۂ تعزیت میں پڑھی گئیں۔

مطبوعات جدیدہ

کاروان زندگی حصہ سوم۔ مرتبہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، تقطیع متوسط، کاغذ، کتابت وطباعت بہتر، صفحات ۳۶۰، مجلد مع گردپوش، قیمت ۳۵ روپیے

پتہ: مکتبۂ اسلام ۵۴/۱۴۲، محمد علی لین، گوئن روڈ، لکھنؤ۔

حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ "کاروان زندگی" کے نام سے اپنی آپ بیتی لکھ رہے ہیں، اس کے ۲ دو حصے پہلے شائع ہوئے تھے، اور معارف میں ان کا مفصل ذکر آچکا ہے، اب یہ تیسرا حصہ شایع ہو رہا ہے، اس میں مولانا نے گذشتہ چار برس ۸۴ء تا ۸۸ء کے حالات و واقعات قلمبند کیے ہیں، ان کی زندگی بھی یک طرفہ تماشا اور مختلف اشغال اور متنوع سرگرمیوں سے عبارت ہے، ان کی ذات علم و دین کی خدمت، اسلام کے فروغ اور سرمایۂ ملت کی نگہبانی کے لیے وقف ہے، ان کا دل خلق کی صلاح و فلاح، بنی آدم کی ہمدردی و خیر خواہی ملت کی کامرانی و سربلندی، اور قوم و وطن کی تعمیر و ترقی کے جذبات سے معمور ہے، انھیں اکثر ملک و بیرون ملک کا سفر درپیش رہتا ہے ماآب من سفر الا الی سفر، مختلف جلسوں کی صدارت، اہم اجتماعات میں شرکت، اداروں اور انجمنوں کی سربراہی، بین الاقوامی کانفرنسوں اور عالمی سیمناروں میں شرکت اور مقالے پڑھنا اور خطاب فرمانا ان کا عام معمول بن گیا ہے، ان گوناگوں مشغولیتوں اور ہنگامی کاموں کے باوجود علمی انہماک اور تصنیفی اشتغال میں فرق نہ آنے دینا مولانا کا اعجاز ہے، ذلک فضل اللّٰہ یوتیہ من یشاء، یہ کتاب ان کے اسی طرح کے

متنوع اشغال واعمال اور مسلسل جہد وجہاد کی داستان ہے، جو تیرہ[۱۳] ابواب پر مشتمل ہے، اس میں
ہندوستان اور عالم اسلام کے علاوہ یورپ کے ملکوں کے مولانا کے سفر کی سرگذشت، ممتاز
اشخاص سے ان کی ملاقات وتبادلۂ خیال کی روداد، اور اہم جلسوں اور سیناروں میں ان کی
تقریروں اور مقالوں کے اقتباسات دیے گئے ہیں، پہلے باب میں عمان، حجاز اور یمن کے سفر
کی سرگذشت، تقریروں کے خلاصے اور یمن کے مشاہدات بیان ہوئے ہیں، دوسرے باب
میں بنگلہ دیش اور پاکستان کے سفر کا حال لکھا ہے، تیسرے باب میں حجاز کے علاوہ بلجیم اور
انگلستان کے سفر کا ذکر آگیا ہے، پانچویں باب میں استنبول اور کراچی کے سفر کی روداد اور وہاں
کے جلسوں کی تقریروں کا خلاصہ پیش کیا ہے، چھٹے باب میں انگلستان، الجزائر اور حجاز کے
سفر کی سرگذشت سنائی ہے، اس میں آکسفورڈ یونیورسٹی کے اسلامک سینٹر اور الجزائر میں ملتقی
الفکر الاسلامی کے سیمنار میں شرکت اور حجاز کے بعض اہم واقعات کی تفصیل درج ہے، نواں
باب ملیشیا کے سفر اور وہاں کی مجالس کے تذکرے اور بعض اداروں اور تنظیموں میں خطابات کیلیے
مخصوص ہے، گیارہویں باب میں لندن وکویت کے سفر کا ذکر ہے، بارہویں باب میں حجاز کے
سفر کا تذکرہ ہے، اس میں حرم کے سانحہ کی تقریب سے حرمین کی حرمت وتقدس اور ان کی
خصوصیات بیان کی گئی ہیں، بیرون ملک کے علاوہ اندرون ملک کے سیناروں کا تذکرہ بھی ہے
اس سلسلہ میں آٹھویں باب میں رابطۂ ادب اسلامی کے دو اجلاس کا ذکر ہے جو ندوۃ العلماء لکھنؤ
اور جامعہ ہدایت جے پور میں ہوئے تھے، تیرہویں باب میں بھی ندوہ میں ہونے والے رابطۂ
ادب اسلامی کے اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ پر جامعہ سلفیہ بنارس کے سیناروں کا تذکرہ ہے،
ہندوستان کے تعلق سے کئی اہم واقعات ومسائل بھی زیر بحث آئے ہیں، جیسے ہندو احیائیت
کی تحریکوں، وشو ہندو پریشد اور آر. ایس. ایس کی اقلیت دشمن مہم اور مسجدوں کو مندروں میں

تبدیل کرنے کے منصوبے، اور پھر اسی خطرناک رجحان کے نتیجہ میں مسز اندرا گاندھی کا وحشیانہ
قتل، ایک باب میں میرٹھ کے ہولناک فساد کی پُردرد داستان بیان کی ہے، چوتھے باب میں
مسلم پرسنل لا کے دفاع وتحفظ میں ہندوستانی مسلمانوں کی عظیم الشان جد وجہد، اپنی اور مسلم پرسنل لا
بورڈ کی سعی وسرگرمی کا ذکر ہے، مولانا نے اپنی قائم کردہ تحریک پیام انسانیت کے لیے متعدد جگہوں
کے اپنے سفر، تقریروں اور ڈائیلاگ کی تفصیل بھی پیش کی ہے، اور ایک باب میں آیۃ اللہ خمینی
کی اسلام کے نام پر اس کی بیخ کنی اور شیعیت واسلام کے تضاد پر اپنی ایک مختصر تصنیف کا تعارف
کرایا ہے، اس کتاب میں اپنے مندرجۂ ذیل مخصوص احباب اور اہل تعلق کی وفات پر گہرے رنج
وغم کا اظہار بھی کیا ہے، مولانا مفتی عتیق الرحمان، مولانا حافظ محمد عمران خان ندوی اور جناب
سید صباح الدین عبد الرحمن، یہ تمام واقعات وحالات سنین وشہور کی صراحت اور تاریخوں کے
تعین کے ساتھ قلمبند کیے گئے ہیں، اس کی وجہ سے یہ کتاب ایک اہم تاریخی دستاویز بھی ہے
جو مولانا کی آپ بیتی سے زیادہ جگ بیتی ہے، اس لیے یہ نہایت دلچسپ ہے، شروع میں
مضامین کی فہرست اور آخر میں اشخاص، کتابوں اور جگہوں وغیرہ کا مفصل اشاریہ بھی دیا گیا ہے،
البتہ بعض جگہ کتابت کی غلطیاں ہیں، ص ۱۴۲ پر سورۂ سبا کی ایک آیت کے ترجمہ میں ہم کے بجائے
تم لکھ گیا ہے۔

فی مسیرۃ الحیاۃ، از مولانا سید ابو الحسن علی ندوی، مترجمہ مولوی سید
سلمان حسینی ندوی، تقطیع کلاں، کاغذ وطباعت عمدہ، صفحات ۲۶۴ مع دیدہ زیب ٹائٹل
قیمت (تحریر نہیں) پتہ:- دار القلم، دمشق، ص ب ۴۵۲۳۔

یہ حضرت مولانا سید ابو الحسن علی ندوی مدظلہ کی کتاب "کاروان زندگی" حصہ اول ودوم کا
عربی ترجمہ ہے، جو مولانا کی طفولیت ۱۹۱۵ء سے ۱۹۸۳ء تک کے حالات وواقعات کا مجموعہ

اور ان کی علمی و دینی، اصلاحی و تبلیغی، قومی و ملی اور تصنیفی سرگرمیوں کی داستان ہے، اردو کے دونوں حصوں پر ان صفحات میں مفصل تبصرہ کیا جاچکا ہے، عربی ترجمہ کی خاص اور نئی چیز اس کا مقدمہ ہے جو ایک عرب فاضل اور مشہور و ممتاز ادیب شیخ علی طنطاوی کے قلم سے ہے، اس میں پہلے مولانا کی موروثی عظمت، خاندانی نجابت، ذاتی فضل و کمال اور علمی، دینی اور تاریخی حیثیت سے ہندوستان کی اہمیت دکھائی ہے، اور اس کتاب کی بعض نمایاں خصوصیات بتائی ہیں، پھر مصنف سے اپنی واقفیت اور تعارف کے ضمن میں ان کی مشہور و مقبول تصنیف "ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین" کا ذکر کیا ہے، اصلاح و دعوت کی طرح ادب اسلامی سے مولانا کی دلچسپی پر گفتگو کرتے ہوئے رابطہ ادب اسلامی کو قائم کرنے اور ان کی تصنیف "روائع اقبال" کا تذکرہ کیا ہے، عربی، اردو اور انگریزی میں مہارت اور فارسی سے واقفیت، ان کی غیر معمولی شہرت و مقبولیت اور ندوۃ العلماء کے بعض امتیازات کو واضح کیا ہے، آخر میں مولانا کی سیرت و شخصیت کے بعض نمایاں اوصاف بیان کیے ہیں، اس سلسلہ میں ان کے زہد، تواضع، زمانہ کے حالات و مسائل سے باخبری، دین و دنیا کی جامعیت، اسلام کے محافظ علماء و تلامذہ کی جماعت تیار کرنے اور ان کے اصول دعوت و طریقہ اصلاح کی خوبی و برتری وغیرہ کا ذکر کیا ہے، مقدمہ سے عالم اسلام میں مولانا کی مقبولیت اور علمائے عرب کی نگاہ میں ان کی قدر و عظمت کا ضرور پتہ چلتا ہے، مگر بقول مقدمہ نگار جو شخص شہرت و عظمت کے بام عروج پر پہونچ گیا ہو، نہ وہ اس طرح کے رسمی تعارف کا محتاج ہے، اور نہ اس کی تصنیف کو کسی مقدمہ و تقریظ کی ضرورت ہے

؎ بہ آب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

سلیس و شگفتہ ترجمہ کے لیے نوجوان مترجم اور عمدہ و خوبصورت طباعت کے لیے ناشر مبارکباد کے مستحق ہیں۔

"ض"

جلد ۱۴۱ ماہ شعبان المعظم ۱۴۰۸ھ مطابق ماہ اپریل ۱۹۸۸ء عدد ۴

مضامین